جلد ۱۰۱ اپریل ۱۹۸۴ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

جہیز ایڈیشن

تفہیم القرآن

کے

دیدہ زیب چرمی جلدوں سے مزیّن جہیز سیٹ

قلیل تعداد میں چھپ چکے ہیں

قیمت ——— ۷۲۵/- روپے

اِس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھایئے اور ہمیں اپنے

آرڈر سے مطلع فرمائیں

اِدارہ ترجمان القرآن

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور ۱۶

فہرست مضامین

جلد ۱۰۱ | اپریل ۱۹۸۴ء مطابق رجب ۱۴۰۴ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

وہ گراں قدر رفیق جو تحریک اسلامی کے ساتھ اوّل روز سے چلے تھے "منھم من قضیٰ نحبہٗ" کے بمصداق اپنا فریضہ باحسن وجوہ انجام دے گئے، ان کی صف میں سے اب چند حضرات "منھم من ینتظر" کے مقام پر باقی رہ گئے ہیں۔ اس چھوٹے سے حلقۂ یارانِ طریق میں سب سے کم تر درجے کا ایک فرد میں بھی ہوں۔

ان معزز و مکرم ہم سفروں کے ساتھ مجھ جیسا ناچیز آدمی بھی یہ دولتِ افتخار رکھتا ہے (اور اس کی بھاری ذمہ داریاں) کہ میں نے ۵ افراد پر مشتمل تحریک دارالاسلام اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ۷۵ موسسین جماعت اسلامی کے ساتھ بیٹھ کر دین کے عقاید اور نصب العین کی روشنی میں اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام کی جس تحریک کا آغاز کیا اس کی تقریباً ساڑھے تینتالیس سالہ سرگرمیاں میرے سامنے عمل میں آئیں، حالات کے مختلف پیچ و خم سے گزرتے ہوئے جو فیصلے ہوئے اور جس طرح کے اقدامات کیے گئے ان کا میں گواہ ہوں۔ بہت سے معاملات میں خود میں نے تحریک کی یا دلائل دیے۔ بے شمار قراردادوں اور بیانوں کے ڈرافٹ میں نے تیار کیے۔ پمفلٹ لکھے، مضامین شائع کرائے، خط و کتابت کی، نوجوانوں نے جب اسلامی جمعیت طلبہ کے مختصر سے حلقے کا آغاز کیا تو مولانا مودودیؒ کے ساتھ اس کی نشست میں میں بھی موجود تھا۔ اور اس وقت جس مقصد اور نصب العین کے مقرر کرنے اور کام کے جس نقشے پر چلنے کا فیصلہ ہوا میں اس کا گواہ ہوں۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے پر جماعت کے نقشہ کار اور پالیسی میں جو ناگزیر تبدیلی آئی اس کی بحثوں کا بھی مجھے علم ہے۔ پہلے انتخابات جن میں پنجاب کی

سسٹم بنا کر جماعت نے حصہ لیا ۔ اس سسٹم اور اس کے متعلقہ عہد ناموں کی تیاری میں میرا حصہ رہا ۔ مولانا کی پہلی نظر بندی (ملتان) کے دور میں نظر بندکیوں؟ والا پمفلٹ میں نے لکھا جس کے اثرات اس دور کے اصحاب جانتے ہیں ۔ میرے سامنے ایک گروہ کی علیحدگی جماعت سے ہوئی ۔ پھر جتنے بھی انتخابات ہوتے رہے ان کے ہونے کے بعد یہ جائزہ لے کر احتساب کیا جاتا رہا کہ اس دوران میں اخلاقی حدود اور اصولی تقاضوں کو کہاں کہاں نظر انداز کیا گیا ۔ کئی بار متحدہ محاذ بنے اور ٹوٹے، ہر بار کے تجربے سے فائدہ بھی ہوا اور بعد کی ناکامی کے زخم بھی کارکنوں کے دلوں میں رہ گئے ۔ اشتراکیت پسند اور لادینیت پسند طبقوں کے ساتھ اتحاد کی اگر اکا دکا صورت تجربۃً عمل میں آئی بھی تو اس کا آخری نتیجہ یہی نکلا کہ ایسے عناصر کے ساتھ سیاسی ضرورتوں کے لیے محاذ نہ بنائے جائیں ۔ اور اگر کوئی محاذ بنے تو ایسی صورت میں جبکہ غلبۂ اسلام کو ایک اُصول کے طور پر مانا جائے ۔ بحالیٔ جمہوریت کے لیے متعدد بار متجانس عناصر کے ساتھ بھی رابطہ ہوا مگر بالعموم اس صورت میں کہ اسلامی رجحانات اور پاکستان کی سالمیت و استحکام کو پسند کرنے والا عنصر غالب رہے ۔

لیکن بہر صورت پچھلا سارا دور اس کڑی پابندی کے ساتھ گزرا کہ ہمارے تمام فیصلوں اور اقدامات میں اسلام اور اس کے تقاضے بطور اصل الاصول کارفرما رہیں گے ۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ حالت تاحال باقی ہے ۔ مگر پھر بھی حالات کے بھنور آج اس بُری طرح ہمارے رفقاء کے سفینوں کو گھما رہے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک طرح کا انتباہ دینے کی ضرورت ہے ۔

یہ سطور میں نے اپنی شان میں قصیدے کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ اس ذمہ داری کے احساس سے لکھی ہیں کہ کاروانِ اقامتِ دین کے ہر راہگیر کو اب تک کے لمبے دور کی روشنی میں توجہ رہے کہ اس کا رُخ اقدام کیا ہے ۔ ضروری نہیں کہ میری گذارشات ہر کسی کے لیے مؤثر یا قابلِ توجہ ہوں ۔ مگر یہ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں کل اور موجودہ نسل نہیں تو بعد کی کوئی نسل، اور میرے ملک میں نہیں تو باہر کے کسی ملک میں کبھی نہ کبھی ان باتوں کو پڑھا جائے گا اور ان پر غور کیا جائے گا ۔ میں صرف اپنے ضمیر کے تقاضے سے خدا کی خوشنودی کے لیے لکھ رہا ہوں ۔ وہ اگر راضی ہو تو اور کسی کی مجھے پروا نہیں ، اور وہ اگر ناپسند کرے تو میں ہزار بار

معاش کا خواستگار ہوں۔

یہ چند باتیں محض یاد دہانی ہیں ____ خود میرے اپنے لیے بھی، اور مخلص رفقائے مقصد کے لیے بھی اور عام مسلمانوں کے لیے بھی ____ یہ سب کچھ ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، مگر بسا اوقات ہم خود اپنی ہی فکر اور اپنی ہی دعوت اور اپنے ہی مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی پرانی باتیں تازہ ہوتی رہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اندازِ بیان میں کچھ تھوڑا سا نیا رنگ پایا جائے۔

حرفِ اوّل

دین و سیاست کی تفریق کی جو لمبی صدیاں ہم پر گزری ہیں، اُن کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز سے دین و سیاست کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ اہلِ دین نے کہا کہ سیاست دُنیاداری ہے اور اس کی ضرورتوں کے ساتھ اسلام کے ایمانی و اخلاقی تقاضے صحیح سلامت رہ ہی نہیں سکتے۔ اور اہلِ سیاست نے طے کر لیا کہ سیاست جس نت نئے ہیر پھیر اور اُتار چڑھاؤ کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اس میں انفرادی دینداری کی کچھ باتیں تو کھپ سکتی ہیں، مگر سچے خدا پرستانہ اُصول و مقاصد کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ یعنی دین پسند ہو تو سیاست حرام، اور سیاست پسند ہو تو دین سے چھٹی۔ یہ دونوں چیزیں یک جا اور یک جان نہیں ہو سکتیں۔ بدقسمتی سے بعض ائمہ اور مجددین کی مساعی، تحریکوں اور قربانیوں کے باوجود ہماری یہ دُوئی ہر دَور میں غالب رہی۔

پھر انگریزی دَور مغرب کا لادین طرزِ سیاست ساتھ لایا اور اس سے اثر پذیر معاشروں میں "یک بام و دو ہوا" کا فتنہ اور بڑھ گیا۔ جس نے دین کو پسند کیا اس نے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو سنبھالا اور دُنیا کے خیر و شر سے قطعِ تعلق کر لیا۔ اور جس کو سیاست کے کارزار میں حصّہ لینا پسند آیا، اُس نے تخت یا تلوار سنبھالی، نعرے ایجاد کیے، عوام کو آج ایک مقصد سے بھڑکایا اور کل دوسرے مقصد سے، آج "الف" سے دشمنی ہوئی اور "ب" سے دوستی تو کل "ب" سے ہم پیالگی و ہم نوالگی قائم ہوئی اور "الف" سے کُٹی ہوئی، محاذ کا رُخ کبھی

مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف۔ اہل سیاست کا مقصد حصولِ اقتدار یا تحفظِ اقتدار یا خاتمۂ اقتدار اور تبدیلیٔ اقتدار قرار پایا اور ان کا قانون اوّل و آخر "قانون ضرورت" بن گیا۔ اس طرح بے اصولی اور مطلب برآری اور وقت وقت کی نئی بولیاں اصول بن گئیں۔ نتیجہ یہ کہ دین داری کا مزاج خانقاہی بنا اور سیاست کا مزاج جنگی و تصادمی۔ جہاں اس طرح کی دینداری آئی وہاں سیاست کے دروازے بند، اور جہاں اس انداز کی سیاست بازی آئی وہاں دین کے چشمے خشک!

یہ تھا اُس دَور کا عظیم ترین فتنہ جو صدیوں ہمارے اعمال کی آبیاری سے پنپتا رہا اور نئے دَور میں خوب برگ و بار لایا۔

اس فتنے کے خلاف برصغیر میں جس طرح پہلے کے اکابر ملّت جن میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور سیدین شہیدین نے فکر اور عملی دونوں حیثیتوں سے مؤثر کام کیا، وہاں حکیم اقبالؒ اور مولینا مودودیؒ نے بڑی زبردست فکری مہم چلائی کہ ذہنوں کو اس تخیل باطل کے شجرۂ خبیثہ سے پاک کر دیا جائے۔ اور مولینا مودودیؒ نے تو عملاً صحیح و جامع تصورِ دین کے تحت کئی سال تک ایک تحریک عملاً چلا کر دکھا دیا کہ دین کے تمام حدود و قیود کو قائم رکھ کر سیاست کی اصلاح کی سعی کی جاسکتی ہے۔ انتخابات اور پارلیمانی ایوانوں میں حصّہ لیا جاسکتا ہے، عوامی حرکات جاری کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی سیاسی تگ و تاز کے ساتھ تمام اسلامی عقاید، عبادات، اخلاقیات اور پیمانہ ہائے خیر و شر کو بغیر کسی ردّ و بدل کے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ یہ نئی دعوت بجائے خود بڑی انقلابی دعوت تھی جس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک طرف مذہبی طبقوں کی طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ کو سہنا پڑا اور دوسری طرف آزاد سیاست کے علمبردار سیکولرسٹ مسلمانوں کی صفوں کی جانب سے تیر کھانے پڑے، مگر بحمداللہ کہ ہماری دعوتِ حق نے ذہنوں کو دلائل سے فتح کیا، یہاں تک کہ نوخیز نسلوں نے بھی اس کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنے اندر جذب کیا۔

اب مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ ہم خود اپنے ہی وضع کردہ اور اعلان کردہ تصوّرِ وحدتِ دین و سیاست کے بارے میں جب کبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ایک طرف اسلامی انقلاب

کے کارکنوں کے ذہنوں میں خطرناک جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف وحدتِ دین وسیاست کے تصوّر کی دعوت ہمارے مخاطب خواص وعوام کے لیے کمزور ہونے لگتی ہے۔

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ دینی وسیاسی سرگرمیوں میں انتہائی احتیاط کے ساتھ توازن قائم کیا جائے۔

حرف دوم

یہ امر ہر معاملے اور ہر مرحلے میں ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ دین کو ایجاد کرنے والے ہم نہیں ہیں۔ بلکہ اسلامی تحریک کے اُصول ومقاصد سے لے کر اس کے طریقہ ہائے اقدام تک خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت کے پابند ہیں۔ ہم اس گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جس کی اگاڑی پچھاڑی کھلی ہو اور وہ جس کھیت میں چاہے گھسے اور اس کی فصل چرتا پھرے یا جس باغ میں چاہے جا کر لوٹنیاں لگائے اور گل وگیاہ کو روند ڈالے۔

جب بھی کوئی مرحلۂ اقدام آئے یا کسی کارروائی کے لیے غور وفکر کیا جائے تو پہلے یہ سوچ لیا جائے کہ طریقِ قرآن اور طریقِ رسول کیا ہے۔

زمانے کے حالات اور تقاضوں کے تغیر کے ساتھ اجتہاد کیا جا سکتا ہے مگر شرائطِ اجتہاد اور اُصولِ اجتہاد کے ساتھ۔ آپ امورِ منصوص یا سنّتِ محکمہ کو کسی بھی قانونِ ضرورت کے تحت بدل نہیں سکتے۔ اور اگر نصوص کے جنگلوں کو پھاند جانا ہو تو پھر آخر اس تکلف کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم سیاسی بے راہ روی کے ساتھ یہ دعوے بھی کریں کہ ہم تو اقامتِ دین کا کام کرنے چلے ہیں، " لہٰذا جو بھی راستے میں آئے گا کٹ جائے گا"

آپ کو یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ پارلیمانی انتخابات کی مخصوص سیاست ضروری نہیں کہ آپ کو اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے تک پہنچا دے۔ اب جب کہ آپ اصلاً " دعوت" ہی کے مرحلے میں ہیں، آپ کو سیاسی جدوجہد کو بھی کسی قدر احوال کی اصلاح کے جذبے کے ساتھ اُصولاً دعوت ہی کے لیے ایک ذریعۂ اثر اندازی بنا کر استعمال کرنا ہے۔

اب اگر ہماری سیاسی سرگرمیاں لوگوں کے سامنے ہمارا ایسا کردار پیش کریں اور ہمارے بیانات اور اعلانات اور اداروں کے قیام، نعروں اور سلوگنوں کی ایجاد اور بعض تبدیلیوں کے لیے اپیل کے طریقوں اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ اتحاد و اختلاف کی ایسی تصویر پیش کریں کہ جس کی وجہ سے خود ہماری اصل ہی کا اعتبار اُٹھ جائے تو اگر ہم نے اقتدار کا بڑا حصہ اور جمہوری ایوانوں میں بہت سی سیٹیں بھی حاصل کر لیں تو ایسی جیت میں فی الحقیقت ہماری ہار پوشیدہ ہے۔

آج جب کہ سیاسی احوال و مسائل کی تند موجیں تیزی سے ہمارے سروں پر سے گذر رہی ہیں، ایسے میں مسلم کردار وہ ہے جو ذہنی توازن کو اُسی طرح برقرار رکھے، جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں پتھر کھا کر اور اپنے خون کی دھاریں اس خاک میں چھوڑ کر برقرار رکھا تھا۔

یہ ہمت نہیں تو اقامتِ دین کا نام لینے کے بجائے کوئی دوسرا کام کیجیے۔

حرف سوم

اسلامی تحریک میں جدید دَور کی اصطلاح کے مطابق ریڈیکل ازم یا استعجال پسندانہ اندھا جوشِ تیز رفتاری نہیں پایا جاتا۔ ریڈیکل ازم یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی جماعت میں سے ایک مختصر گروہ اس جذبے سے سر اُٹھاتا ہے کہ وہ ان اُصول و حدود اور تاریخی تسلسلِ کار کے بعض تقاضوں کو توڑ کر جلدی سے آگے بڑھ جائے گا اور آناً فاناً انقلاب لے آئے گا[1] بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ مارکسی تصوّر کی اصطلاح میں تاریخ کو جست لگانے پر مجبور کر دے گا یا نئے انداز سے کہیں تو وہ دس بیس برس بعد کے انقلاب

---

[1] عالم اسلام کی دینی تحریکوں میں کہیں کہیں یہ رجحان انقلابِ ایران کے ظہور کے بعد اُبھر رہا ہے حالانکہ انقلابِ ایران کا عمل بہت پیچھے سے شروع ہو کر یہاں تک پہنچا اور وہاں کے حالات کی کچھ خصوصیات بھی ہیں جن پر دوستوں کی نظر نہیں۔

کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حال کے لمحے تک لے آئے گا۔[1]

اس قسم کا ریڈیکل ازم لوگوں کو ایڈونچرسٹ یا کارنامہ گر (بہ اصطلاح عام مہم جو) بنا دیتا ہے۔ وہ قسم قسم کے نئے اُصول اور نئے تجربے ایجاد کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کے اُصول اور تجربے کے بعد وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ اسلام سلامت ہے، آخر اسلام کو کیا خطرہ؟ وہ کوئی کانچ کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔

اسی نظریے کے تحت فارورڈ بلاک بنتے ہیں اور جہاں فارورڈ بلاک بنتے ہیں وہاں عام دنیوی سیاسی جماعتوں میں اندر ہی اندر ایک رسہ کشی چلتی رہتی ہے، لیکن دینی سیاسی جماعتوں کے ذہنوں میں پہلے انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر بحران اور آخرکار شکست و ریخت ہونے لگتی ہے۔

لہٰذا خدا را اپنے آپ کو ریڈیکل ازم اور فارورڈ بلاک جیسے تصوّرات سے بچائے رکھیے۔ یہ راستہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں بالآخر تخریب و تشدّد کی طرف جاتا ہے۔ اسلامی دعوت میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی جب وہ تخریب و تشدّد کے راستے پر پڑ جائے، اسلامی انقلاب کے راستوں پر چلنے والوں کی سب سے بڑی قوت "مظلومیت" ہوتی ہے اور یہی مظلومیت چاروں طرف دل و دماغ کو فتح کرتی جاتی ہے۔

حرف چہارم

دینِ برحق کی تحریک چاہے کسی مرحلے میں ہو، خاص طور پہ دعوت کے ابتدائی یا ارتقائی مراحل

---

[1] بھارت میں تقسیم سے قبل کی کانگریس کے ہوتے ہوئے پہلے پہل تھوڑا سا ریڈیکل رجحان جواہر لال نہرو میں تھا مگر مہاتما گاندھی کے نظریہ عدم تشدّد نے اس نورس رجحان کو زیادہ اُبھرنے نہیں دیا۔ بعد میں جوں جوں نہرو صاحب پر ذمہ داریاں بڑھتی گئیں وہ کانگریس کی بنیادی پالیسی کے علمبردار بنتے گئے۔ اسی طرح ایک تجربہ سوبھاش چندر بوس کا تھا، مگر جیسا وہ تجربہ تھا ویسا ہی جو کچھ حشر اس کا ہوا سب کے سامنے ہے۔

ہیں، اس کے لیے ایسا جوش کار آمد ہے جو ہوش کے تحت رہ سکے، ایسا اقدام مفید ہے جو تدبر و تفکر سے اٹھایا جائے، ایسا انقلابی عمل نتیجہ خیز ہے جو صبر و حکمت کا پابند ہو۔ ہر کام جو کیا جائے، پہلے اس کے متعلق شرعاً یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کیسا ہے اور سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سنتِ صحابہ (خصوصاً خلفائے راشدین) رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر اس کام کا پورا نقشہ تیار کیا جائے، سوچنے میں یہ ملحوظ رکھا جائے کہ حامی قومیں کونسی ہیں، مخالف کونسی، اور ان کے درمیان کس طرح اقدام کیا جا سکتا ہے کہ حمایت میں اضافہ ہو اور مخالفت میں کمی، یا مخالفت زیادہ ہو بھی تو وہ دوسروں کی حمایت کو اور بڑھا دے۔ غور کر لینا چاہیے کہ کسی جنگ کے لڑنے کی صورت میں فتح ہوئی تو کیا ملے گا اور شکست ہوئی تو نتائج کیا ہوں گے؟ آپ کے مصروفِ کشمکش ہونے سے دوسری کونسی طاقتیں ہیں جو اپنا میدان پیدا کرنے کا فائدہ اٹھائیں گی؟ کس وقت کے حالات کیسے ہوں گے؟ کس مرحلے میں کیا طریقے کارگر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا کسی معرکے میں آپ کی قیادت آپ کے کارکنوں کو پابندِ حدود اور وابستۂ اخلاق رکھ سکے گی؟ آپ ظلم کو مٹانے کے لیے یا اسے کمزور کرنے کے لیے ظلم کا طریقہ تو اختیار نہ کریں گے، جھوٹ کے توڑ کے لیے جھوٹ سے تو کام نہ لیں گے، جبر و تشدد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے خود تو جبر و تشدد کی حرکات نہ کرنے لگیں گے؟

یہ ساری چیزیں اگر وقت پر توازن سے نہ سوچی جا سکیں اور جوشِ اقدام اور جنونِ انقلابیت غالب ہو جائے تو پھر آپ جو چاہیں کریں، آپ دینِ برحق کی اقامت کا حق اللہ کی نگاہ میں ادا نہیں کر سکتے۔

فیصلہ کن چیز تو آپ کا کردار ہے۔ کیا آپ کا کردار کسی مہم میں ایسا ہے گا کہ عوام متاثر ہو جائیں؟ پولیس اور جیل کا عملہ متاثر ہو جائے؟ بیوروکریسی کی صفوں میں آپ کے قدردان پیدا ہو جائیں؟ اخبارات اور سیاسی لیڈر آپ کی دعوت کا لوہا ماننے لگیں کہ کیسی اعلیٰ دعوت اور مقدس نصب العین ہے جس نے اس درخشاں کردار کے ساتھ ظلم کے سامنے کھڑے ہونے والے انسان پیدا کیے ہیں؟

یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۷۴ء کے قادیانی ایجی ٹیشن کے زمانے میں مولینا مودودیؒ جہاں ایک طرف قادیانیت کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتے تھے اور حکومت سے یہ منوانا چاہتے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، وہاں وہ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ ایک تو مسئلہ دستور کی اسلامی بنیادیں طے کرانے کی لبِ بام پہنچی ہوئی تحریک کو مؤخر کر دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ لاقانونیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مولینا پر اس زمانے میں سخت دباؤ تھا۔ بہت زیادہ بیرونِ جماعت سے اور کسی قدر خود جماعتی کارکنوں کی طرف سے بھی۔ لیکن مولینا اپنے اُصولی موقف پر چٹان کی طرح مضبوطی سے جمے رہے۔ مجھے اس مجلس شوریٰ کا حال یاد ہے جب کہ قادیانی ایجی ٹیشن کے متعلق جماعت کے رویّے کا فیصلہ کرنے کی بحثیں ہو رہی تھیں، اور بیچ بیچ میں ہر دو چار منٹ بعد کبھی فیصل آباد سے اور کبھی ملتان سے اور کبھی راولپنڈی سے اور کبھی لاہور کے کسی علاقے سے جوش انگیز خبروں کے ٹیلی فون آ رہے تھے۔ اور جب آپریٹر کی کوئی چٹ پڑھ کر سنائی جاتی تو ذہنوں میں افکار کا سارا تانا بانا بکھر جاتا۔ مگر مولینا مودودیؒ ٹھنڈے دل سے چٹ ایک طرف رکھ کر زیرِ غور مسودہ کو پھر پڑھنے میں لگ جاتے اور اس کے الفاظ اور جملوں پر گفتگو ہوتی۔ ایک جملہ پورا ہوتا تو پھر ایک ٹیلیفونی پیغام آجاتا اور پھر وہی صورت۔ مگر کام پھر اسی تدبر و تفکر کے ساتھ ہونے لگتا جیسے پہلے ہو رہا ہوتا۔ یہاں تک کہ تحریر مکمل ہوگئی اور سب ارکان اس پر مطمئن ہوگئے۔

جذباتیت سے اس طرح ماورا رہ کر اُصول پسند تحریکوں کے لیڈر اور مشیر اور کارکن حکمت و تدبر سے کام کرتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ جسے یہ کام آئندہ کرنا ہو، تحریک خواہ کسی بھی مرحلے میں ہو، وہ اِس طرح کے دل و دماغ لے کر آئے۔ جذباتی ہیجانات اور اندھے فیصلوں کے ساتھ دوسرے انقلاب چل سکتے ہیں، مگر اسلامی انقلاب کا کام نہیں ہوسکتا۔

حرف پنجم

اسلامی سیاست کی راہ پر کبھی کوئی منفی کام بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ مثلاً راستے سے کسی

روڑے یا کانٹے کو ہٹا دینا تاکہ آگے بخوبی چلا جا سکے۔
لیکن اُصولاً اسلامی سیاست منفی سیاست نہیں ہے۔
منفی سیاست کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا سارا زور اس بات پہ ہو کہ فلاں کے دورِ اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے کسی "لا" کے بعد "الا" کیا ہوگا۔ برصغیر کی تاریخ میں آج تک ہر طرف سے طرح طرح کی جماعتیں منفی سیاست کی علمبردار بن کے کام کرتی ہیں۔ کسی حکمران سے اذیت اُٹھانے کے بعد وہ اس غرض کے جمع ہو جاتی ہیں کہ اور جو کچھ ہو، اس شخص سے نجات ملے۔ حالانکہ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ یا تو ایک اُصول کو ختم کر کے اپنا دوسرا اُصول غالب کریں، یا کسی شخص کے ہٹائے جانے کے بعد اس سے بہتر شخص کو کرسی پہ بٹھانے کا قابلِ اطمینان منصوبہ رکھتے ہوں۔ ورنہ خالص منفی سیاست وہی رنگ اختیار کرے گی جیسا یہ تھا کہ انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے کُتّوں اور سُوروں کے ساتھ بھی اتحاد کیا جا سکتا ہے۔
اس منفی سیاست کا ایک تجربہ ایوب خاں کا خاتمہ تھا۔ پھر قوم کو کیا ملا؟ یحییٰ خاں، یحییٰ خاں گیا تو ذوالفقار علی بھٹو کو چھوڑ گیا۔ بھٹو کے خلاف طوفان اُٹھا اور ان کی کشتی اُلٹ گئی۔ پھر کیا ملا؟ ایک نیا مارشل لا جس کی عمر مسلسل بڑھتی رہی ہے۔ اس مارشل کو ہٹا دیکھیے اس کے بعد کیا ملے گا، یا تو ایک اور مارشل لا، یا ایسی جمہوریت جس کی لایعنیت کی مار کھا کر قوم پھر چیخ اُٹھے گی۔ اِس اندھے جوئے کے لیے ہم اتحاد قائم کرنے بھی چلیں تو اور نہیں تو کم سے کم نفاذِ اسلام کی شرط ساتھ ہو، کم سے کم مظلوم افغانوں کی ہمدردی و حمایت کی شرط ساتھ ہو، کم از کم انسانوں کو خدا کے عطا کردہ حقوق کی بحالی کی ضمانت ساتھ ہو، کم از کم منکرات و فواحش اور مخلوط معاشرے کے فروغ کی روک تھام کی یقین دہانی ساتھ ہو۔
کیا ایسے جوئے میں ایم آر ڈی سے اتحاد موزوں رہے گا؟ پیپلز پارٹی سے موزوں رہے گا؟ سوشلسٹوں اور سیکولرسٹوں سے موزوں رہے گا؟ تمام بھلی بُری جماعتوں سے موزوں رہے گا؟
ہمارے کندھوں پہ اُصولوں اور اعلانوں کا ایک پُشتارہ لدا ہے۔ ہمارے تاریخی

تسلسل کی روداد کا طومار ہماری بغلوں میں ہے۔ کتاب و سنّت کی کسوٹیاں سامنے رکھی ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کو چھوڑنے سے ہم موقع پرستوں (OPPORTUNISTS) کی تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ کا غلط اقدام ہماری پچھلی ساری تاریخ کو دریا برد کر دے گا۔ اور ہمارے کردار کا برسوں پرانا کھرا سکّہ کھوٹا ہو جائے گا۔

ہمیں یہ بھی زیرِ غور رکھنا ہے کہ ہزارہا لوگ جو ہماری طرف محبت و عقیدت کی نظریں اُٹھائے ہم سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں، کیا ان کے ذہن پراگندہ نہ ہو جائیں گے۔

کسی گٹھ جوڑ کے بجائے جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ بے اصول اور آزادی پسند لیڈروں کا غلبہ قائم ہو جائے، ہمارے لیے ممکن اور صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ ہم تنہا اپنی بازی اپنے شرائط پر کھیلیں اور دوسروں کو پاؤں رکھ کر چڑھنے کے لیے اپنا کندھا پیش نہ کریں۔ لیکن اگر اتحاد حالات کے تحت مفید اور ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر صرف محبانِ دین و وطن کے ساتھ اتحاد کیا جائے۔

یوں بھی سارے اتحاد دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر اتحاد ہوا تو صدر صاحب جن لوگوں کو اپنی پارٹی قرار دے رہے ہیں (اور ان میں کچھ اور قوتیں بھی شامل ہیں) آنا تو اُن کو ہے۔ پھر کیوں نہ اپنا کھیل صرف اپنے بل بوتے پر کھیلا جائے، خواہ چار، پانچ یا دس پندرہ سیٹوں ہی کے لیے ہو۔

جب تحریک کی پالیسی اس بارے میں طے پا جائے گی تو میں بھی ہر دوسرے ساتھی کی طرح اسے قبول کروں گا ــــ بادلِ ناخواستہ یا خواستہ!

حرف ششم

اس دور میں ہر جگہ طلبہ کی نوجوان قوت کی اہمیت بڑھی ہے اور نوجوان قیادت کے غلغلے بلند ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے ان سلوگنوں کو بطور ایک نئے نظریے کے قبول کیا ہو، میں انہیں غلط سمجھتا ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی قیادت کے لیے بالعموم چالیس برس پورے کرنے

پر انبیاء کو دعوت الی اللہ اور قیادتِ جماعت کے لیے اُٹھایا ہے تو پھر اسلامی اُصولوں کے تحت اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے کے لیے نوجوانوں کو خالد جاں باز (رضی اللہ عنہ) تو بننا چاہیے مگر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔ اوّل الذکر بزرگ نے خالد کو آگے بڑھایا، وہ زور و شور سے آگے بڑھے، مؤخر الذکر بزرگ نے ان کو یک لخت پیچھے ہٹا دیا، حضرت خالد نے ادب سے اس حکم کے آگے سر جھکا کر اپنے آپ کو ایک عام سپاہی کی جگہ کھڑا کر لیا۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت، نہ احتجاج۔ پہلے بھی اللہ کی رضا مطلوب تھی، اب بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی۔ پہلے بھی خلیفہ اوّل کو اُمت کے قائد کی حیثیت سے واجب الاحترام سمجھا، بعد میں بھی خلیفہ دوم کے حکم کی اطاعت نہایت ادب سے کی۔ حضرت خالد نے تاریخِ اسلام میں وہ عظیم الشان مثال چھوڑی ہے کہ آج کے ہر صاحب صلاحیت نوجوان لیڈر کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

نوجوانوں کا کام ہے کہ والدین کا ادب کریں، اساتذہ کا احترام کریں، اپنے ہم مرتبہ نوجوانوں سے اختلافات کرتے ہوئے رواداری سے کام لیں، کوئی بات منوانے کے لیے تشدد سے کام نہ لیں اور احیائے اسلام کے کام کے لیے جو بزرگ میدان میں موجود ہوں (اور جن کے خلوص پر انہیں اعتماد ہو) اُن سے رہنمائی لیں اور مشورے حاصل کریں اور وہ اگر کسی امر میں روک دیں تو اسلام کے ایک اطاعت پسند سپاہی کی حیثیت سے رُک جائیں۔

اگر عمر کے ابتدائی جوشیلے مرحلوں میں دل و دماغ کو اس طرح تربیت نہ دی گئی تو آگے چل کر پھر اپنے آپ پر بریک لگانا ممکن نہیں ہوگا۔

میں جب اس طرح کی باتیں نوجوانوں سے کہتا ہوں تو انہیں پسند نہیں آتیں، بلکہ انہیں خوشامدانہ لہجہ بہت مرغوب ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں چاٹ ڈال دی ہے کہ ان کی منت سماجت ہوتی رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم دینی اُمور اور بڑے بڑے معاملات و اقدامات سے متعلق اخلاقی تقاضوں کو اُن پر اچھی طرح واضح نہ کرنا مداہنت ہے۔ میں اُن سے بہت محبت بھی رکھتا ہوں، مگر میں دینی معاملات میں اُن سے مداہنت نہیں برت سکتا۔

اس قوم کی مستقبل کی اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں کہ شاید کل یہ لوگ تحریکِ اسلامی کے علمبردار بن کے اُٹھیں گے، لہٰذا اسلامی ذہن کے نوجوانوں کو ایمان و اُصول اور اخلاق و شائستگی کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اعتماد کے رنگوں سے (جن کو بھی وہ پسند کریں) رہنمائی حاصل کریں اور تقاضا کریں کہ ہماری غلطیاں بھی واضح طور پر ہمیں بتائی جائیں تاکہ ہم ان سے پرہیز کریں اور ہمیں راہ صداقت پر اقدام کے لیے صاف صاف لفظوں میں ہدایات بھی دی جائیں تاکہ ہم اُن کی پابندی کریں۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

ہمارا مقصد، مسلک اور طریقِ کار

اخذ و اقتباس کردہ - محمد یوسف صاحب لائبریرین منصورہ لاہور

اب میں آپ سے جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی جس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے۔ وہ ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ دُنیا میں اللہ کے دین کو پوری طرح سے، پوری زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا اور کوئی مقصد اور نصب العین نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے، خواہ وہ رُکن کی حیثیت سے وابستہ ہو، یا کارکن اور متفق کی حیثیت سے وابستہ ہو، اُسے یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ۔

جماعتِ اسلامی کا اصل مقصد دینِ حق کو مکمل طور پر خدا کی زمین پر غالب کرنا ہے۔ اگر ہم سیاسی کام بھی کرتے ہیں تو اقتدار حاصل کرنے، یا دوسری سیاسی اغراض کے لیے نہیں کرتے، بلکہ اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ ان رکاوٹوں کو دُور کیا جائے جو دینِ حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے مُلک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار ہو سکے —— جماعتِ اسلامی کا یہ موقف کیوں ہے اور اپنے اس موقف پر کیوں اصرار ہے کہ وہ جمہوری ذرائع ہی سے اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے اور وہ غیر جمہوری ذرائع کے استعمال کی کیوں مخالف ہے۔ اس کو میں چند الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں —— خدا کی قسم ہے، اور میں قسم بہت کم کھایا کرتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی

نے یہ جو مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ کسی قسم کے تشدد اور توڑ پھوڑ کے ذریعے سے ، کسی قسم کی دہشت پسندانہ تحریک کے ذریعے سے اور کسی قسم کی خفیہ تحریک یا سازشوں کے ذریعے سے ملک میں انقلاب برپا نہیں کرنا چاہتی ، بلکہ خالصتاً جمہوری ذرائع سے انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے ، یہ مسلک قطعاً کسی کے خوف کی وجہ سے نہیں ہے ۔ یہ ہرگز اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کبھی کسی ابتلاء کے وقت اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ ہم دہشت پسند نہیں ہیں ، ہمارے اوپر تشدد یا قانون شکنی کا الزام نہ لگایا جائے ۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پیشِ نظر اسلامی انقلاب ہے اور اسلامی انقلاب کسی خطۂ زمین میں اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہاں کے رہنے والے لوگوں کے خیالات تبدیل نہ کر دیئے جائیں ۔ جب تک لوگوں کے افکار اور ان کے اخلاق و عادات میں تبدیلی نہ لائی جائے اس وقت تک مضبوط بنیادوں پر کوئی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا ۔ اگر زبردستی کسی قسم کے تشدد کے ذریعے سے ، یا سازشوں اور خفیہ ہتھکنڈوں کے ذریعے سے کوئی انقلاب برپا کر دیا جائے تو اس کو کبھی دوام اور ثبات نصیب نہیں ہوتا اور بالآخر اسے کسی دوسرے انقلاب کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے ۔ اسی طرح اگر دھوکے بازیوں اور جھوٹ اور افتراء کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت کر ، یا کسی اور طریقے سے حکومت پر قبضہ کر کے کوئی سیاسی انقلاب برپا کر دیا بھی جائے تو چاہے وہ کتنی دیر تک قائم رہے ، لیکن جب وہ اکھڑتا ہے تو اس طرح اکھڑتا ہے جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہیں تھی ۔

(اجتماع ارکان سے خطاب مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء ۔ بحوالہ ہفت روزہ آئین ۷ اپریل ۱۹۷۲ء)

بہنو اور بیٹیو!

جناب میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان

(یہ جامع پیغام میاں طفیل محمد امیر تحریکِ اسلامی پاکستان منصورہ لاہور، نے مدرسۃ السلفیہ للبنات فیصل آباد کی سالانہ تقریب کے لیے بھجوایا ہے)۔

مجھے یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ مدرسہ سلفیہ للبنات فیصل آباد، دو اپریل کو اپنا اٹھارھواں سالانہ اجتماع عام منعقد کر رہا ہے جس کی آخری نشست کو "خاتون کانفرنس" کی شکل دی جا رہی ہے اور اس میں مُلک بھر سے ہزاروں مسلمان خواتین شریک ہو رہی ہیں۔ میں اِس موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی پاکستانی مسلمان بہنوں سے پاکستان کے موجودہ حالات میں مسلمان خواتین کے فرائض کے سلسلے میں چند گذارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری دینی اور ایمانی بہنیں ان پر غور فرمائیں گی اور اِس سلسلے میں اپنا تاریخ ساز کردار ادا کریں گی۔

میری دینی بہنو اور بیٹیو! میں سب سے پہلے آپ کی توجہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد گرامی کی طرف دلاتا ہوں۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبمحمد رسولاً و بالاسلام دینا۔

یعنی ایمان کا مزا چکھا اُس شخص نے جو راضی ہوگیا اس پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے رہنما ہوں اور اسلام ہی اس کا طریق زندگی ہو۔"
اس حدیث مبارکہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے اسلام کو برضا و رغبت اور مکمل طور پر اپنا طریق زندگی اور حضور نبی کریم کو اپنی زندگی میں رہبر و رہنما نہیں بنایا وہ اسلام اور ایمان کے مزے تک سے ناآشنا ہے۔ اس نے دین کا ذائقہ تک نہیں چکھا۔

گویا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ دنیا میں خدائی، فرمانروائی اور آقائی کے جتنے بھی مدعی پائے جاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک رب العالمین ہی بلاشرکت غیرے اطاعت و فرمانبرداری کا مستحق ہے۔ باقی سب کی فرمانبرداری اس کے تابع ہے۔ اس کے سوا جس ہستی کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ آدمی ان کی مرضی کی پیروی کرے، ان کے احکام بجا لائے اور اپنی شخصیت کو ان کے تابع کرے، ان سب میں سے صرف ایک اللہ ہی کی ہستی ایسی ہے جس کے آگے بلاچوں وچرا سر تسلیم خم کرنا چاہیے اور وہی ذات گرامی ہے جس کی مرضی کی اُسے غیر مشروط پابندی اور جس کی رضا کی اُسے ہر حال میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے مختلف طریقوں کے درمیان آدمی یہ فیصلہ کرلے کہ اُسے صرف وہی طریقِ زندگی پسند ہے جس کو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ دوسرے کسی طریقے کو اسلام پر ترجیح دینا تو درکنار، اس کی طرف کوئی رغبت اور میلان بھی اس کے دل میں نہ ہو۔ وہ اسلام ہی کو سچے دل سے صحیح طریق زندگی تسلیم کرے۔ اسی طرح مسلمان ہونے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ دنیا میں انسان کی رہبری و رہنمائی کے جتنے بھی دعویدار گذرے ہیں یا آج پائے جاتے ہیں، ان سب کے درمیان ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو وہ اپنی رہنمائی اور ہدایت کے لیے چن لے اور وہ یہ فیصلہ کرلے کہ اُسے بس نبی آخر الزماں ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے۔

جو شخص اس طرح اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما تسلیم کرلے وہ شخص صحیح اور سچا مسلمان ہے اور ایسے شخص کی دوسری صفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس تک کو اس شریعت کے تابع کردے گا

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ پھر جہاں اور جس معاملے میں اللہ اور رسول کا کوئی حکم موجود ہو وہاں وہ یہ نہیں کہتا اور کہہ سکتا کہ اس بارے میں میری یہ رائے ہے اور یہ پرانی بات اب نہیں چل سکتی۔ جس شخص کا یہ رویہ ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حقیقت میں اسلام پر ایمان ہی نہیں لایا ہے۔ وہ اسلام کا دعویٰ کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ حقیقی ایمان یہ ہے کہ انسان اپنی پسند کو، اپنی خواہشات کو، اپنے جذبات کو، اپنے خیالات، نظریات اور رسم و رواج سب کو پوری طرح اسلام کے ماتحت اور اس کے تابع کر دے۔

خواتین محترم! اس دین اسلام کے مخاطب جس طرح سے مرد ہیں اسی طرح سے عورتیں بھی اس کی مخاطب ہیں۔ چنانچہ میں یہاں موجود خواتین اور اپنی تمام بہنوں اور بیٹیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی شخصیتوں کو مردوں کی شخصیتوں کی تابع مہمل نہ بنا دیں۔ نہ اپنے دین کو مردوں کے حوالے کر کے بیٹھ جائیں۔ اسلام کی رو سے عورتیں مردوں کا ضمیمہ نہیں ہیں۔ وہ مردوں سے الگ اور اپنی مستقل شخصیت رکھتی ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ جو مرد کریں گے وہ بھریں گے اور جو عورتیں کریں گی وہ بھریں گی۔ عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح فرداً فرداً خدا کے روبرو پیش ہونا اور اپنے اعمال و افعال کا حساب دینا ہوگا۔ ہر عورت قیامت کے روز اپنی قبر سے اٹھے گی، اپنے باپ یا شوہر یا بھائی کی قبر سے نہیں اٹھے گی۔ اپنے اعمال کا حساب دیتے وقت کوئی عورت یہ کہہ کر بری الذمہ نہ ہو سکے گی کہ میں اپنے کنبے کے مردوں کے پیچھے چلتی رہی۔

لہٰذا میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ سب اپنے طریق زندگی اور تمام طور طریقوں کا خود جائزہ لیں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور طریقے کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر خدانخواستہ ان سے کہیں انحراف پایا جاتا ہو تو بلا تاخیر اصلاح احوال کی کوشش کریں۔ اس بارے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام غیر مشروط اور کلی اطاعت کا طالب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

ادخلوا فی السلم کافۃ - اسلام میں پورے کے پورے اپنے سب کچھ سمیت

داخل ہو۔"

وہ جزوی یا آدھی پونی اطاعت پر راضی نہیں ہے۔ واضح بات ہے کہ جب کوئی انسان اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کردہ راہ سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کرے گا وہ اسلام سے ہٹ کر کسی اور راستے پر پڑ جائے گا۔

اب میری ان گذارشات کی روشنی میں جو محترم خواتین سوچ سمجھ کر اسلام کو اپنی زندگی کا مکمل طریق حیات بنانے کا فیصلہ کریں انہیں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اُن کو عملاً کیا کام کرنے چاہئیں۔

آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی زندگیوں اور رہن سہن کو اسلام کا نمونہ بنائیں۔ آپ میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا بے لاگ محاسبہ کرے کہ اس میں جاہلیت کا کوئی اثر تو نہیں پایا جاتا۔ اور اگر ایسے کوئی اثرات آپ اپنی زندگیوں میں پائیں تو اُن سے اپنی زندگیوں کو پاک کرنے کی فکر کریں۔ اپنے خیالات کو، اپنے طرزِ معاشرت کو، اپنے اخلاق کو اور اپنے پورے طرزِ عمل کو دینِ اسلام کے مطابق ڈھالیں۔ ہر ایک سے پیار، محبت، اخلاق، ملنساری اور انکساری سے پیش آئیں۔ چغلی، بدگوئی، غیبت، فضول و بے کار باتوں سے پرہیز کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حُسنِ الاسلام المرءِ ترکہ ما لا یعنیہ یعنی انسان کے اسلام کا حُسن یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں سے پرہیز کرے۔

آپ کا دوسرا کام یہ ہے کہ آپ اپنے اپنے گھروں کی فضا کو درست کریں۔ اس فضا میں پُرانی جاہلیت کی جو رسمیں چلی آ رہی ہیں یا جدید دور کے جو واہیات طریقے اور فیشن آپ کے گھروں میں داخل ہو گئے اور ہو رہے ہیں، ان سب کو نکال باہر کریں۔ روشن خیالی کے زعم میں بعض خواتین مغربی تہذیب کے بُرے اثرات کو ترقی یافتہ ہونے کی علامت سمجھ کر قبول کر رہی ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ ہندوانہ رسم و رواج کو بھی اور جدید مغربی تہذیب کے حیا سوز فیشنوں کو بھی اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں۔ اسلام نے جس سادہ طرزِ معاشرت کی تعلیم دی ہے اس کو بلا خوف و خطر اپنائیں۔ سادہ زندگی اور کفایت شعاری کو اپنی عادت بنائیں اور قناعت کی صفت کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ اس کے بغیر ہم اپنے

ملک اور قوم کو رشوت، خیانت، مہنگائی اور عام بد دیانتی کی وبا سے نجات نہیں دلا سکتے۔

آپ کا تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اسلامی طرز پر تربیت دیں۔ میرے نزدیک وہ بچے بڑے بدقسمت ہیں جن کے کانوں میں صبح کے وقت قرآن کی آواز نہیں پڑتی۔ وہ اپنے گھر کے لوگوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھتے۔ آپ کو اس فکر میں لگ جانا چاہیے کہ آپ کے گھر والوں کی معاشرت میں اور زندگی کے مختلف معمولات میں اسلام نمایاں طور پر نظر آئے۔ آپ کے بچے اپنی آنکھوں کے سامنے اسلامی زندگی کو چلتا پھرتا دیکھیں، وہ ہر چیز میں اسلام کا مزہ چکھیں اور اس سے اثر قبول کریں۔ اُن کے کانوں میں بار بار خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑیں۔ وہ دن میں پانچ مرتبہ گھر میں نماز کا منظر دیکھیں، پھر وہ اپنی فطرت کے تحت بڑوں کی تقلید کریں اور انہیں نماز پڑھتا دیکھ کر خود بخود نمازی بن جائیں۔ وہ توحید کا پیغام ماں کی آغوش سے ہی سنیں، عبادت کا مفہوم سمجھیں، اسلام کا نقش اُن کے دلوں پر قائم ہو، ان کی عادات اور ان کے اطوار درست ہوں، ان کے اندر اعلیٰ اسلامی ذوق پیدا ہو۔ غرضیکہ مسلمان عورتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے گھروں اور گودوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنائیں تاکہ ان میں وہ مسلمان نسل پروان چڑھے جو پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی نظریاتی مملکت بنا سکے۔

آپ کا چوتھا کام یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر کے مرد مثلاً باپ، بھائی، بہنیں، شوہر، بیٹے یا دوسرے اعزہ اسلام کے سوا کسی اور راہ پر چل رہے ہیں تو اُن کو بھی اسلام کی طرف بلائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں پر بہت گہرے اثرات ڈالتی اور ڈال سکتی ہیں۔ مسلمان عورت اگر ڈٹ جائے کہ اس گھر میں معاشرت اسلامی ہوگی جس میں نماز ہو، روزہ ہو، پرہیزگاری اور حسن اخلاق ہو، خدا کا خوف اور اسلامی آداب و تہذیب کا لحاظ ہو اور اس گھر میں کوئی حرام کمائی کی شے داخل نہیں ہوگی، خواہ فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے، تو آپ کی آنکھوں کے سامنے مردوں کی زندگیاں بدلنے لگیں گی۔ ہر ایک مسلمان بیوی اگر صاف صاف واضح کردے کہ اسے حرام کی کمائی سے سجائے ہوئے ڈرائنگ روم پسند نہیں۔ رشوت کے روپے سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا گوارا نہیں، بلکہ وہ حلال کی محدود کمائی میں روکھی سوکھی

روٹی کھا کر جھونپڑے میں سادہ زندگی گذارنے کو ترجیح دے گی تو ہمارے معاشرے سے حرام خوری کے بہت سے اسباب بلا تاخیر ختم ہو جائیں گے اور رائج الوقت بے شمار خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس طرح اگر آپ سب اصلاح احوال کی مہم شروع کر دیں تو آپ اپنے اعزہ و اقربا، اپنے خاندان کے لوگوں، اور اپنے میل ملاپ رکھنے والے گھرانوں کو بھی بہت سی خرابیوں سے بچا سکتی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اچھے طریقے سے اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں کے سامنے جاہلیت کے طریقوں پہ تنقید کریں، انہیں اسلام کے احکام سمجھائیں، ان کو اسلام کے حدود سے آگاہ کریں اور خود بھی اسلامی حدود کی پابندی کر کے اپنا صحیح عملی نمونہ ان کے سامنے پیش کریں تو ہمارے معاشرے کا پورا ڈھانچہ درست ہو سکتا ہے۔

آپ کا پانچواں کام یہ ہے کہ آپ میں سے جو خواتین تحریر کی صلاحیت رکھتی ہوں وہ اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو اور ٹی۔ وی کے پروگراموں پر نظر رکھیں اور ان میں جو پروگرام یا جو چیز خلاف اسلام پائیں ان پہ تنقید کریں۔ ذرائع ابلاغ کے ذمہ داروں اور اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھیں اور ان کے پروگراموں اور کالموں کے ذریعے جو فحاشی پھیلائی جا رہی ہے اس کے خلاف احتجاجی مراسلات و مضامین لکھ کر انہیں بھیجیں۔

سب سے آخری بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغرب زدہ خواتین کا ہر میدان میں تعاقب کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی سرگرمیوں پہ نظر رکھیں۔ وہ اسلامی احکام و اقدار کے خلاف کوئی قرارداد پاس کریں تو آپ اس کے مقابلے میں مسلمان خواتین کی تنظیموں کی طرف سے دس قرار دادیں پاس کر کے اخبارات کو بھجوائیں۔ وہ اس سلسلے میں کوئی جلسہ کریں یا جلوس نکالیں تو آپ بھی شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان سے بڑا جلسہ کریں اور بڑا منظم اور مؤثر جلوس نکالیں اور حکومت پہ دباؤ ڈالیں کہ وہ مٹھی بھر مغرب زدہ خواتین کے آگے ہتھیار ڈال کر خدا اور اس کے فرمانبردار بندوں کو غضب ناک کرنے سے باز رہے۔ اسے ان چند بگڑی ہوئی خواتین کا نہیں ان کروڑوں صاحب ایمان مسلمان خواتین

کے جذبات و احساسات کا پاس و لحاظ رکھنا چاہیے جو ان سے اور ان کے خیالات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ اس طرح اپنے آپ کو منظم کر کے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گی تو آپ وطن عزیز میں غلبہ اسلام کی راہیں ہموار کر سکے اللہ تعالےٰ کے ہاں بے انتہا اجر پائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو بہترین عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ادارہ کے کرم فرماں سے ضروری التماس

- براہ مہربانی ادارہ کی طرف سے ارسال کردہ وی۔پی۔پی واپس نہ کریں۔ خریداری یا آرڈر منسوخ کرانا ہو تو قبل از وقت مطلع فرمائیں۔ وی۔پی۔پی واپس کرنا ایک اخلاقی کمزوری ہے۔ اور اس سے ادارہ کو نقصان ہوتا ہے۔
- ادارہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

شکریہ

مینجر ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

حامدی صاحب کے تحریکی سفر کی داستان

(بہ شکل خطوط بنام قاری منہاج الدین صاحب)

مولانا خلیل حامدی ڈائرکٹر ادارہ معارف اسلامی۔ منصورہ۔ لاہور

ماریشس اور اسمرا کے بارے میں رُوداد احوال لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ میں ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ماریشس سے دارالاسلام آگیا تھا۔ پورٹ لوئس سے دارالسلام تک ہوائی جہاز کی فلائٹ تقریباً ۴ گھنٹے کی تھی۔ ایئرپورٹ پر مجھے چھوڑنے کے لیے محمد حسین دھال آئے۔ لفت ہانزا کے کاؤنٹر پر جب ہم سامان دینے لگے تو سامان لینے والی لڑکی دھال صاحب سے کہنے لگی کہ میں مسلمان ہوں اور میں نے ایک غیر مسلم (جو شاید ہندو ہے) سے شادی کر لی ہے، مگر شادی سے پہلے میں نے اُس پر یہ شرط عاید کی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسے اسلامک سرکل کے دفتر میں لاؤں تاکہ آپ یا ملک محمد حسین صاحب اُسے اسلام کے بارے میں مضبوط و مستحکم کر دیں۔ میں نے محمد حسین دھال صاحب سے پوچھا کہ کیا ماریشس میں مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں سے شادی کر لیتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایسے نام نہاد مسلمان گھرانے جو اسلام سے ناآشنا اور مغربی تہذیب کے رسیا ہو چکے ہیں، مذاہب کی حدود و قیود سے بالا ہیں ان گھرانوں کی لڑکیاں اور لڑکے جہاں چاہیں شادی کر لیں۔ تاہم ہم لوگ مسلمانوں کے اندر برابر اس بات کو پھیلا رہے ہیں کہ کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔

ایئرپورٹ پر امیگریشن افسر بھی دھال صاحب کا پیروکار نکلا۔ اُس نے دُور سے ہمیں

دیکھ لیا اور پاسپورٹ لے کر خود ہی خروج لگا دیا۔ ہمارا جو جہاز دارالسلام جا رہا ہے، اس میں زیادہ تر مسافر فرینکفرٹ جانے والے ہیں۔ یہ جرمن اور فرانسیسی ہیں، مگر ——— اعوذ باللہ ——— کیا عرض کیا جائے کہ یہ لوگ حیوانیت کے کس درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے نزدیک شرم و حیا نام کی قدر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ غیرت و حیا سے محروم، لباس ساتر سے عاری، ذوقِ انسانی سے بے گانہ اور جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ہر حالت اور ہر وقت بے تاب۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اپنے دین کا فہم عطا کیا، اپنے راستے کی ہدایت دی اور اپنے رسولؐ کے ذریعے ہمیں زندگی کا صحیح قرینہ بتایا۔

رات کے آٹھ بجے ہم دارالسلام کے ہوائی اڈے پہ پہنچ گئے۔ یہ ایئرپورٹ کیا ہے بھیک منگوں کا اڈہ ہے۔ ویزا لگانے والا افسر، ہیلتھ سرٹیفکیٹ چیک کرنے والا افسر، کسٹم آفیسرز تمام کے تمام بات بات پہ خیرات مانگتے ہیں۔ خاکسار نے آج تک جتنے ملک دیکھے ہیں، کسی جگہ ہوائی اڈے پر ایسی گداگری نہیں دیکھی۔ یہ ہے دراصل اُس اشتراکیت کا پھل جسے بابو عبدالرحمٰن اور عبید کرومے نے ۱۹۶۴ء میں یہاں جاری کیا ہے۔ بڑی مشکل اور ردّ و کد کے بعد ایئرپورٹ والوں سے نجات حاصل کی۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی، اس لیے ٹیکسی لے کر دارالسلام شہر روانہ ہو گیا اور کمبودیا نامی ہوٹل میں اُتر گیا۔ صبح اُٹھا تو معلوم ہوا کہ آج اتوار ہے اور اس پہ مزید کرسمس کی تیاریوں کے دن ہیں، اس لیے لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے ہیں۔ خاکسار بعض دوستوں کو ہوٹل سے فون کرتا رہا، مگر چھٹی کی وجہ سے لوگ گھروں میں نہیں ملے۔

ہوٹل سے نکل کر بازار میں گردش کی۔ دکانیں بند ہیں۔ صرف ریستوران اور بار کھلی ہوئی ہیں۔ سڑکوں پہ پرائیویٹ کار نہیں چل رہی ہے، بلکہ صرف ٹیکسی نظر آ رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تنزانیہ میں چھٹی کے دن پرائیویٹ کار چلانا ممنوع ہے تاکہ پٹرول کی بچت ہو سکے۔ بازاروں میں بے کار اور مفلوک الحال مردوں اور عورتوں اور بچوں کے جھنڈ کے جھنڈ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ موسم گرم ہے اس لیے بے روزگار لوگ فٹ پاتھوں پر ہی شب باشی کر لیتے ہیں۔

تنزانیہ دو ملکوں کے اتحاد کا نام ہے، تنگانیکا اور زنجبار۔ ثانی الذکر ملک یعنی زنجبار دراصل قدیم عرب مملکت ہے۔ یہ مملکت ۱۸۵۶ء تک سلطانِ مسقط کے تابع تھی، مگر جب مسقط کے سلطان سید سعید کا انتقال ہوا تو زنجبار الگ مملکت کے طور پر وجود میں آگیا۔ اور مقامی شیوخ نے اس پر اپنی حکومت قائم کرلی ۱۸۹۰ء میں یہ برطانوی حمایت کے زیرِ اثر آگیا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اسے آزادی مل گئی، مگر آزادی کے بعد اس پر یہ اُفتاد پڑی کہ زنجباری کمیونسٹوں نے انقلاب برپا کردیا اور پھر خود عرب کمیونسٹوں نے عرب عوام کا قتلِ عام کیا۔ تانگانیکا کی تاریخ بھی زنجبار سے مختلف نہیں ہے، البتہ تانگانیکا میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ تانگانیکا ۱۹۱۸ء میں برطانوی انقلاب کے تحت آیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسے اقوامِ متحدہ کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۱ء میں اسے آزادی ملی اور عروشہ ڈیکلریشن کے تحت زنجبار اور تانگانیکا ۲۶ اپریل ۱۹۶۴ء کو یونائیٹڈ ریپبلک آف تنزانیہ میں تبدیل ہوگئے اور اس روز سے یہ ملک ایک اشتراکی ریاست میں تبدیل ہوگیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اب اشتراکیت سے سیر ہو چکے ہیں۔ مقامی سکے کا یہ حال ہے کہ بنک میں سرکاری بھاؤ سے ایک امریکی ڈالر کے عوض ۱۴ تنزانی روپے ملتے ہیں اور بازار میں ایک ڈالر کے عوض ۵۰ تنزانی روپے ملتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کی قلت اس قدر ہے کہ دکانیں خالی پڑی ہیں۔

دارالسلام سمندر کے کنارے واقع ہے۔ جہاں تک قدرتی حسن و جمال کا تعلق ہے تنزانیہ بڑا شاداب اور دلکش ملک ہے۔ ساحلِ سمندر بڑا خوبصورت ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ درختوں کے جھنڈ ہیں۔ آم، ناریل، پپیتا اور شریفہ کے باغات بکثرت ہیں۔ گھروں میں بھی لوگوں نے پھل دار درخت لگا رکھے ہیں۔ بڑی زرخیز زمین ہے۔ اگر کسی ٹہنی کو زینت کی خاطر نصب کردیا جائے تو وہ بھی چند روز کے اندر جڑیں نکال لیتی ہے۔ بیگان ویلی نے شاہراہوں پر کیف آور فضا پیدا کر رکھی ہے۔ یہ سب حسن و جمال دامنِ دل کو کھینچے بغیر نہیں رہ سکتا، مگر انسانوں کی طرف دیکھیں تو سیاہ اور بوسیدہ چہرے جیسے بے آباد کھنڈر ہوں۔ پھٹے ہوئے بے ڈھنگے لباس جیسے کسی اشتراکی شاعر نے

آزاد نظم لکھی ہو۔ کم سن بچے اور نوخیز دوشیزائیں غربت اور بے کسی کے ہاتھوں چکنا چور۔ ایک طرف یہ حال اور دوسری طرف سفید فام یورپین مشنری عظیم الشان کاروں میں اِدھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کے بنگلے شاندار اور اُن کی بود و باش نہایت اعلیٰ و ارفع۔ ایک ایک انگریز کی کوٹھی پر دس دس افریقی لڑکے اور لڑکیاں خدمت کے لیے موجود۔

اتوار کا دن تھا۔ خاکسار نے دارالسلام کے بعض حصوں کا مشاہدہ کیا۔ اہم مقامات پر فوج کے سپاہی تعینات ہیں، لیکن ان کی حالت بھی بڑی دگرگوں۔ بوسیدہ وردیاں کہنہ اور ازکار رفتہ ہتھیار اور مفلوک الحالی کی وجہ سے نہ اُن کی رفتار میں چال کی اور نہ اعضا میں پھرتی اور توانائی۔ کسی ریستوران کے پاس سے گذریں تو ریستوران کے اندر بیٹھ کر کھانے والے کم اور باہر کھانے والوں کو تاک تاک کر دیکھنے والے زیادہ۔ کتابوں کی ایک دکان کے پاس سے خاکسار کا گزر ہوا تو شو روم میں جو کتابیں رکھی ہوئی نظر آئیں ان میں لینن اور مارکس اور ان کے خیمہ برداروں کی تصنیفات یا پھر عیسائیت کا تبلیغی لٹریچر۔ بعض کتابیں افریقی قبائل کی تاریخ و ثقافت سے متعلق بھی تھیں۔ کمبوڈیا ہوٹل کا مالک ایک مسلمان ہے۔ اس وجہ سے یہ ہوٹل بُرائیوں سے پاک ہے، البتہ یہاں کھانے کا انتظام معقول نہیں ہے۔ خاکسار چند قدم کے فاصلے پہ ایک ریستوران میں کھانے کے لیے گیا۔ اس کا مالک مسقطی عرب ہے۔ عربی زبان بولتا ہے۔ مجھ سے جب اُس کا تعارف ہوا تو کہنے لگا کہ آج کل یہاں کاروبار بالکل ٹھپ ہو چکا ہے۔ مُلک میں اشیاء کی قلّت اور بے روزگاری عام ہے۔ ہم لوگ اب اپنا کاروبار ٹھپ کر کے مسقط جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے اپنی بشرٹ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ جدّہ میں دس ریال میں ملتی ہے اور یہاں دارالسلام میں اوّلاً تو ملتی نہیں ہے اور اگر ملے گی تو چار سو تنزانی روپے سے کم نہ ملے گی۔ اس کے ریستوران میں صرف چاول اور گوشت تھا۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ یہاں یہ بھی غنیمت ہے کہ چاول کا راشن مل جاتا ہے اور ہم لوگ ریستوران چلا رہے ہیں، ورنہ بعض اوقات تو اشیائے خوردنی کا اس قدر بحران پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ تنگ آ جاتے ہیں۔

دارالسلام پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ معاشی حالت تو تباہ ہو چکی ہے اخلاقی حالت بھی انتہائی خراب ہے۔ چوری، لوٹ مار اور عصمت فروشی کا رواج عام معلوم ہوتا ہے۔ دارالسلام کی آبادی ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے موجب ۷ لاکھ، ۵ ہزار ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ عیسائی اور ارواح پرست بھی ہیں جرائم کا ارتکاب زیادہ تر غیر مسلم آبادی کرتی ہے۔ مسلمان اپنی مظلومیت اور پسماندگی کے باوجود نسبتاً بہتر اخلاق اور کردار کے مالک ہیں۔ دارالسلام پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں یہ صحیح معنوں میں امن و سلامتی کا گھر تھا اور اسی نسبت سے دارالسلام کہا گیا، مگر اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سات سال کے اندر ڈوڈوما (DODOMA) شہر کو ملک کا دارالحکومت بنا دیا جائے گا۔ خاکسار کو یہ بات سن کر بہت حیرت ہوئی کہ ملک معاشی پسماندگی کا شکار ہے اور حکومت ایک نیا دارالحکومت تعمیر کرلنے کی سوچ رہی ہے۔

۹ دسمبر ۱۹۸۳ء کو خاکسار نے علی الصبح ہارون سجن کی دکان پر فون کیا۔ یہ دکان ہمارے رفیق محمد احمد کی دکان ہے اور یہ نوجوان سونے کا کاروبار کرتے ہیں، اس لیے "محمد سونے والا" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دکان کمبوڈیا ہوٹل سے دور نہیں ہے۔ خاکسار چہل قدمی کرتے وہاں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک محمد احمد صاحب دکان پر نہیں پہنچے۔ ان کے پڑوسی کی دکان کھل چکی تھی۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا اور میں اُن کی دکان میں بیٹھ گیا۔ ان صاحب کا نام شمعون ہے۔ داؤدی بوہرہ فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ یہاں ملازم ہے اور دکان کا اصل مالک ایک ہندو سیٹھ ہے۔ ملاقات ہوتے ہی شمعون نے مجھے پاکستانی دیکھ کر دل کے پھپھولے پھوڑنے شروع کر دیے۔ اُس نے بتایا کہ چند ماہ پیشتر حکومت نے تمام بڑے بڑے دکانداروں کو یک دم جیل میں ڈال دیا۔ اُن پر الزام یہ لگایا گیا کہ یہ لوگ اشیائے ضرورت کا ذخیرہ کر رہے ہیں اور اُسے عوام الناس کے ہاتھ فروخت نہیں کرتے، مگر شمعون کا کہنا تھا کہ لوگوں کے پاس قوتِ خرید نہیں ہے۔ تنزانی روپیہ بالکل گر چکا ہے جب کہ لوگوں کی آمدنی محدود اور لوگوں کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ معاشی زندگی پر سب سے بڑا اثر حکومت کی زرعی اصلاحات نے ڈالا ہے۔ حکومت نے افراد کے ہاتھ سے زمین لے لی اور اجتماعی کھیتی باڑی کا انتظام

جاری کر دیا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی زراعت سے دلچسپی بہت کم ہوگئی اور یک دم معاشی بحران پیدا ہوگیا۔ دیہاتوں سے لوگ اٹھ اٹھ کر شہروں کا رُخ کرنے لگے تاکہ روزگار حاصل کرسکیں۔ نتیجۃً ایک طرف اشیاء کی قیمت اور مکانوں کے کرائے چڑھ گئے اور دوسری طرف بیروزگاروں کے گروہ کے گروہ شہروں میں بے کار رہنے لگے۔ پھر کیا تھا، چوری اور ڈکیتی حد درجہ بڑھ گئی۔ دیہاتی لڑکیاں عصمت فروشی پر اتر آئیں۔ اور پورا معاشرہ اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ اب حکومت نے تاجروں کو جیل میں ڈال دیا ہے۔ اس طرح سے رہی سہی تجارتی حرکت بھی جامد ہوگئی ہے۔ اب حال ہی میں حکومت نے نیا قانون جاری کیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے حکومت تجارت کرنے کا صرف اسی آدمی کو لائسنس دے گی جو کم از کم دو ایکڑ زمین کاشت کرے گا یا کروائے گا۔ آخر میں شمعون کہنے لگا: میر اسیٹھ بھی اب اس ملک کو خیرباد کہنے کی سوچ رہا ہے۔ الغرض میاں شمعون تو بہت کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، مگر اس دوران "محمد سونے والا" آئے اور مجھے جس انسان کی تلاش تھی وہ مل گیا۔

محمد سونے والا کچھی ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ تحریک اسلامی کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں گجراتی زبان میں انہوں نے جماعت کی چند کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے بتانے لگے کہ کل چھٹی کی وجہ سے میں بعض اصحاب سے ملنے گیا ہوا تھا، اس لیے افسوس ہے کہ کل آپ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ محمد احمد میاں جیولر ہیں۔ اب میں ان کی دکان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اِکا دُکا گاہک آنا شروع ہو گئے ہیں۔ دکان کا دروازہ گو کشادہ ہے مگر لوہے کی جالی کا گیٹ لگا ہوا ہے، اُسے ہر وقت تالا لگا رہتا ہے۔ جب کوئی گاہک داخل ہوتا ہے تو گیٹ مین تالا کھول دیتا ہے اور اسے اندر کر دیتا ہے۔ اندر آکر بھی وہ ایک اور چھوٹے سے کٹہرہ نما کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اس کمرے کا دروازہ الیکٹرک کا ہے۔ محمد احمد صاحب اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بٹن دباتے ہیں اور وہ دروازہ کھلتا ہے۔ اگر وہ بٹن نہ دبائیں تو گاہک اسی کمرے میں محبوس رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات اور استحکامات قائم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مقامی افریقی باشندے یکایک دکانوں میں گھس جاتے ہیں اور مال لوٹ کر لے جاتے ہیں، بلکہ مزید برآں یہ کہ دکاندار کو بھی بعض اوقات قتل کر دیتے ہیں۔ جتنی بڑی بڑی دکانیں دارالسلام میں ہیں

ان کا یہی نظامِ دخول و خروج ہے۔ یہ اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ تنزانیہ امن و سکون اور امانت و دیانت اور ترقی و خوشحالی سے محروم ہو چکا ہے۔ محمد احمد صاحب نے مزید بتایا کہ ہم صرف اُس آدمی کو سودا دیتے ہیں جو کسی اور قابلِ اعتماد آدمی کی طرف سے تعارفی خط لے کر آتے۔ اگر کسی کے پاس یہ خط یا شناخت نہ ہو تو ہم اُس سے بات ہی نہیں کرتے۔ میں جتنی دیر دکان میں بیٹھا رہا، یہ تماشا دیکھتا رہا۔ دو تین عورتیں سونے کا زیور خریدنے یا بیچنے کے لیے آئیں۔ اُن کے ہاتھوں میں تعارفی خطوط تھے۔

محمد نے ملک محمد حسین صاحب اور دیگر اصحاب کی خیریت دریافت کی۔ جماعت کے لوگوں کے حالات پوچھے۔ اسی دوران انھوں نے ایک اور فعال تحریکی کارکن ہاشم گرانا صاحب کو بھی فون کر دیا۔ شیخ احمد زرگر بھی آگئے۔ اُن کی بھی جیولری کی دکان ہے جو اسی بازار میں ہے۔ یہ جامع مسجد مارکیٹ کہلاتی ہے۔ مسجد ساتھ ہی ہے۔ شیخ احمد سُنّی مسجد کمیٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ دینی معاملات میں بہت دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ایشیائی مسلمانوں کے اندر اچھا اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ اب ہم تمام لوگ محمد احمد کی دکان سے اُٹھ کر اپنے پرانے اور گہرے سوڈانی دوست عباس مصطفیٰ مقبول کے ہاں چل دیے۔ موصوف مدینہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور آٹھ سال سے سعودی عرب کے دارالافتا کی طرف سے دارالسلام میں دعوتِ اسلامی کی اشاعت کا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ تحریک اسلامی پاکستان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑا قلبی تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم کے زمانے میں مولانا مرحوم سے مدینہ منورہ میں مل چکے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں پاکستان بھی تشریف لائے تھے اور ایک ہفتہ منصورہ میں رہے تھے۔

عباس صاحب دفتر میں مل گئے۔ مجھے دیکھ کر حیرت و مسرت سے ملے جلے جذبات میں ڈوب گئے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں نے کل سارا دن دارالسلام میں گزارا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ میں نے انھیں عرض کیا کہ جن اصحاب کے فون نمبر میرے پاس تھے وہ فون پر ملے نہیں۔ اور آپ کا فون نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ بہرحال دیگر احباب تو رخصت ہو گئے تاکہ احبابِ تحریک سے رابطہ قائم کریں اور اجتماعی ملاقات کا انتظام کریں۔ عباس مجھے دفتر میں لے کر

بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ اور بھی تین چار سوڈانی مبعوث ہیں ۔۔ یہ سب حضرات دارالسلام میں مختلف طریقوں سے دعوتِ اسلامی اور تعلیم دینی کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ ہم دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ دو تنزانیہ کی لڑکیاں آئیں اور انہوں نے اسلامی لٹریچر مانگا جس سے وہ اسلام کی اصل حقیقت کو سمجھ سکیں ۔ عباس صاحب نے بتایا کہ مقامی نوجوانوں کے اندر اسلام کی بڑی جستجو پیدا ہو رہی ہے اور اسلامی لٹریچر کی اس قدر مانگ ہے کہ ہم اُسے پورا نہیں کر پاتے ۔

عباس صاحب اپنے دفتر سے اُٹھے اور میرے ساتھ کمبو دیا ہوٹل چل دیئے ۔ عباس صاحب نے ہوٹل سے میرا سامان لیا اور اپنے گھر لے آئے ۔ ان کا مکان دارالسلام کے ترقی یافتہ علاقے میں واقع ہے ۔ اسی علاقے میں غیر ملکی سفارت خانے اور مشن رہتے ہیں ۔ مکان خوبصورت ہے ۔ دونوں طرف پھل دار درخت ہیں ۔ عباس صاحب سے معلوم ہوا کہ دارالسلام میں کرائے کا مکان دستیاب ہو جانا جوئے شیر لانا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ اشتراکی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی جتنی عمارات تھیں "قومی تحویل" میں لے لیں ۔ ان عمارات کی نشانی یہ ہے کہ ان کی پیشانی پر سواحلی زبان میں "مساجل ومجامبو" کے الفاظ درج ہوں گے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ عمارات سرکار کے ہاں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں اور اب سرکار کی ملکیت ہیں ۔ دارالسلام، زنجبار، ڈوڈوما، مورو گورو اور دیگر مقامات پر جو عمارت بھی قابلِ لحاظ ملے گی خواہ وہ رہائشی ہو یا تجارتی حکومت کے قبضے میں ہے ۔ اس اندھا دھند اشتراکی اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب افراد عمارات نہیں بناتے اور جو عمارات کسی طرح سے بچ گئی ہیں اور ابھی افراد کے قبضے میں ہیں انہیں وہ مرمت نہیں کراتے ۔ حکومت بھی اپنے قلیل وسائل اور حکمران پارٹی کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے نئی رہائشی عمارات تعمیر نہیں کر سکی ۔۔۔ آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور مکانات کی تعداد وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تھی ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں مکان حاصل کرنا کس قدر مشکل بلکہ محال ہے ۔

(باقی بر صفحہ ۵۶)

صدارتی نظام کی شرعی حیثیت

جناب محمد امین صاحب

(۲)

اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس وقت جو سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات ہیں ان کو صحابہ کرام کے زمانے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ خلافتِ راشدہ کے وقت جو سیاسی نظام تھا اس کے شکل پذیر ہونے اور کامیابی سے چلنے میں جو عناصر کارفرما تھے وہ یہ تھے:

— معاشرہ سادہ اور پیچیدگیوں سے مبرا تھا[۱]۔

— عام لوگوں میں ایمان کا گہرا شعور موجود تھا جس نے انہیں بے خوف اور نڈر بنا دیا تھا۔ وہ حکام سے دبتے تھے اور نہ ڈرتے تھے بلکہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق آزادیٔ رائے کا حق استعمال کرتے تھے اور بوقت ضرورت حکمران کی مخالفت کرتے تھے[۲]۔

---

[۱] ڈاکٹر ثروت بدوی کا کہنا ہے (النظم السیاسیۃ ص ۲۰۶) کہ ابتدائی معاشروں میں عموماً ترکیزِ سلطنت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عربوں میں قبائلی نظام رائج تھا جس میں زیادہ تر اختیارات قبیلہ کے سردار کے پاس ہوتے تھے، نیز عربوں کے گرد و پیش بادشاہت بھی ایک نظامِ حکومت کے طور پر موجود تھی۔

[۲] اس کی مثال یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے کم مہر مقرر کرنا چاہا تو ایک عورت نے انہیں ٹوک دیا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ خلاف قرآن ہے۔ اسی طرح (باقی بر صفحہ آئندہ)

— حکام متقی اور خوفِ خدا رکھنے والے تھے، اپنے آپ کو عام لوگوں سے برتر نہ گردانتے تھے اور اپنے آپ کو عام لوگوں کے سامنے جواب دہ سمجھنے سے پہلے خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے [1]

— عام لوگوں کو حکمرانوں پر پورا پورا اعتماد تھا، وہ ان کے اخلاص فی الدین، ان کے زہد و تقوٰی اور بے غرضی نیز دُنیاوی اُمور میں ان کے فہم و تدبر پر کامل یقین رکھتے تھے۔

— عوام اور حکمران دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر شریعت کی پیروی کے حریص تھے اور قانونِ شریعت کو صحیح معنوں میں اپنی زندگیوں میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی مکمل بالادستی کو تسلیم کرتے تھے [2]

(حاشیہ صفحہ سابق)

ایک بدّو نے حضرت عمرؓ کو کہا کہ اگر تم ٹیڑھے چلے تو ہم اپنی تلواروں سے تم کو سیدھا کر دیں گے اور ایک دوسرے موقع پر ایک صحابی نے ایک پبلک اجتماع میں آپ کو کہہ دیا کہ ہم تمہاری اطاعت نہیں کریں گے جب تک تم یہ نہ بتا دو کہ تم نے اپنی قمیض کا کپڑا بغیر استحقاق کے تو بیت المال سے نہیں لے لیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دجلہ کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی بھوک سے مر گیا تو مجھ سے اس بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور جب ایک بدو نے انہیں کہا کہ اگر تم ٹیڑھے چلے تو ہم اپنی تلواروں سے تم کو سیدھا کر دیں گے تو حضرت عمرؓ نے اُسے ڈیفنس رولز یا کسی سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھجوانے کی بجائے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو غلط روی کی صورت میں ان کو سیدھا کر سکتے ہیں۔

[2] اس کی مثال یہ ہے کہ لوگوں سے اگر کوئی جرم سرزد ہو جاتا تو وہ خود چل کر آجاتے کہ ہمیں سزا دی جائے۔ اور جب مہر کے معاملے میں ایک عورت نے حضرت عمرؓ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اب آپ موجودہ حالات کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ کیا یہ عناصر ہمارے آنے کے معاشرے میں موجود ہیں؟

— عوام کے دینی شعور کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے عشرِ عشیر بھی نہیں رہا نیز اس وقت سے لے کر آج تک حکمرانوں کے ظلم و ستم نے انہیں بحیثیت مجموعی نڈر اور بے باک نہیں رہنے دیا۔

— حکمرانوں کی کیفیت یہ ہے کہ تقویٰ اور زہد تو دور رہا وہ برسرِ عام گالیاں دینے اور یہ اعلان کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرتے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔

— شریعت کی بالادستی کا یہ عالم ہے کہ نمازی اور حاجی حکمران بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ "اختیار کُلی" وہ خود ہیں اور اپنے بنائے ہوئے فوجی قانون کو شرعی قانون پر غالب رکھتے ہیں۔

— آج اسلامی ممالک میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ عوام اور حکمران ایک دوسرے سے دور ہیں، اُن کے درمیان ہم آہنگی نہیں کشمکش ہے، عوام کا کوئی طبقہ اگر معاشرے میں اسلامی رنگ لانا بھی چاہتا ہے تو حکمران اسے اپنا دشمن سمجھنے اور اسے ملیامیٹ کرنے کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

— مشینی اور الیکٹرانک دور نے زندگی کو پیچیدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ممالک کی آبادی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کو ٹوکا تو آپ نے بے ساختہ کہا "عورت نے ٹھیک کہا اور عمر سے غلطی ہوئی" اور جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت عمرؓ نے اُن کے سامنے لوگوں کی یہ رائے پیش کی کہ لشکر اسامہؓ کو نہ بھیجا جائے کیونکہ فوجی قوت کے منقسم ہو جانے اور مدینہ پر حملے کا اندیشہ ہے اور اگر لشکر بھیجنا ہی ہے، تو کسی بڑے سردار کی زیر سرکردگی بھیجا جائے تو حضرت ابوبکرؓ جیسا عمر رسیدہ، مدبر اور حلیم الطبع آدمی بھڑک گیا اور فرمایا "اے عمر! تیری ماں روئے، رسول اللہ نے اُسے مقرر فرمایا اور تم مجھے کہتے ہو کہ اسے ہٹا کر دوسرا آدمی بھجوا دوں۔ خدا کی قسم یہ لشکر اسامہؓ کی زیر سرکردگی جائے گا خواہ درندے مدینے میں گھس کر مجھے اُٹھا لے جائیں"۔ (ابوبکر الصدیقؓ للشیخ علی الطنطاوی صفحہ ۱۸۷)۔

کی تعداد اور ریاست کا دائرہ کار پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور فنِ حکمرانی ایک سائنس بن چکا ہے۔ معاشی مسائل، معاشرتی حالات، لوگوں کے ذہنی اور فکری رویّے، ان کی عادتیں اور رسم و رواج وہ نہیں رہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر تھے۔ قبائلی نظام اور بادشاہت بطور ایک نظام حکومت کے تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ جمہوریت کا غلغلہ ہر کہیں بلند ہو رہا ہے۔

ان حالات میں موجودہ معاشرے کو خلافتِ راشدہ کے زمانے پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے اور شکلی لحاظ سے جو نظام اُس وقت رائج تھا اُسے ہو بہو کیسے آج کی سوسائٹی میں نافذ کیا جاسکتا ہے؟ جن عناصر نے اسے ایک کامیاب سیاسی نظام بنایا تھا جب وہ عناصر ہی سرے سے مفقود ہیں تو آج اگر اُسے نافذ کر بھی دیا جائے تو وہ بالکل اُلٹ نتائج کیوں پیدا نہیں کرے گا؟ آج بھی اگر حکمران حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ہوں تو اُن کو زیادہ اختیارات دیئے جانے کی حمایت کی جاسکتی ہے، لیکن اس وقت جیسے حکمران ہمیں میسر ہیں اور جو حالات ہمیں درپیش ہیں اُن میں کسی ایک آدمی کو زیادہ اختیارات دینے کا کوئی جواز آخر شریعت سے کیسے ڈھونڈا جاسکتا ہے؟ یہ حالات تو اس امر کے متقاضی ہیں کہ آج کے مجتہدین ان حالات و ظروف کی روشنی میں سیاسی نظام کا نیا ڈھانچہ بنانے کے لیے نئے سرے سے اجتہاد کریں[1]۔ اور اس کی بنیاد تقسیم اختیارات پر رکھیں تاکہ کسی حکمران کو ظلم و جبر کا موقع نہ ملے اور وہ عوام کے سامنے جواب دہ بھی ہوں۔

جہاں تک اجتہادی اُمور میں تحقیق المصالح، سدّ الذرائع اور مقاصد الشریعہ جیسے فقہی قاعدوں کا تعلق ہے تو یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ تحقیق المصالح کا مطلب یہ ہے کہ غیر منصوص

---

[1] امام قرافی نے ایسے حالات میں نئے اجتہاد کو جائز ہی نہیں بلکہ انتہائی ضروری قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ایسا نہ کرنا خلافِ اجماع اور دین میں جہالت کے مترادف ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ایسے اجتہاد کے لیے مجتہد مطلق کی بھی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب الاحکام للقرافی صفحہ ۲۲۱ و ۲۳۲۔

امور میں ایسے اجتہادی فیصلے کیے جائیں جو مسلمانوں کے مصالح کو پورا کرنے والے ہوں اور ان کو مشقت اور تکلیف میں ڈالنے والے نہ ہوں۔ سدّ الذرائع کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایسے فیصلے سے گریز کیا جائے جو فتنے اور فساد کا سبب بن سکتا ہو اور مقاصد الشریعہ کے قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ فیصلے اس طریقے سے کیے جائیں کہ ان سے مقاصد الشریعہ بالعموم پورے ہوں اور وہ شریعت کے مقاصدِ عامہ سے متصادم نہ ہوں۔ اب ان امور کے نقطہ نظر سے دیکھیے اور غور کیجیے کہ کیا ہمیں ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جس میں زیادہ تر اختیارات ایک آدمی کے پاس ہوں یا اس کے بالکل برعکس کسی ایسے نظام کی ضرورت ہے جس میں زیادہ تر اختیارات ایک آدمی کے پاس نہ ہوں۔

خلافت راشدہ کے بعد سے لے کر طویل صدیوں پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کے سیاسی نظام کا ایک طائرانہ جائزہ لیجیے اور بتایئے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو مصیبت اور فتنے میں ڈالا ہے وہ یہ امر تھا کہ حکمران جابر، مستبد اور ضرورت سے زیادہ بااختیار تھے یا اس چیز نے ڈالا ہے کہ حکمرانوں کے پاس اختیارات کی کمی تھی اور مجلس شوریٰ یا عدلیہ یا دوسرے کسی ادارے نے ان کو نڈھال کر رکھا تھا۔ اور اس کے بعد ذرا ایک نظر اپنے موجودہ حالات کا بھی جائزہ لے لیجیے کہ اس وقت روئے زمین پر جتنے مسلمان ممالک ہیں ان کی مشکل آیا یہ ہے کہ ان میں حکمرانوں کے پاس زیادہ اختیارات نہیں، یا ان ملکوں میں مسلمان عوام کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کے حکمران ضرورت سے زیادہ بااختیار ہیں، فوج اور پولیس کی قوت سے ان پر حکمرانی کر رہے ہیں اور کسی کو ہلنے اور بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مخصوص جغرافیائی اور سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر سوچیئے۔ مملکت پاکستان پہلے دو سیاسی، انتظامی، لسانی اور جغرافیائی وحدتوں پر مشتمل تھی۔ طرزِ حکومت ایسا تھا کہ اختیارات ایک آدمی کے ہاتھ میں تھے اور جب کئی برس ایک ہی "مضبوط" آدمی برسرِ اقتدار رہا جس کا تعلق ایک صوبے سے تھا تو لامحالہ دوسرے صوبے میں احساسِ محرومی پیدا ہوا جس کو اچھالا اور بڑھایا گیا حتیٰ کہ ملک ٹوٹ گیا۔ موجودہ

بچا کھچا پاکستان بھی چار انتظامی، سیاسی، جغرافیائی اور لسانی وحدتوں پر مشتمل ہے اور یہ وحدتیں آبادی، وسائل، زبان اور معاشرت کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ کمیونسٹ، انتہا پسند اور نظریہ پاکستان کے اندرونی و بیرونی دشمن اس گھات میں لگے بیٹھے ہیں کہ کہیں چنگاری نظر آئے تو وہ اُسے شعلہ بنائیں، جیسا کہ حال ہی میں سندھ کے واقعات نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمیں ایک ایسے طرزِ حکومت کی ضرورت ہے جس میں اختیارات ایسے اداروں کے پاس ہوں جنہیں سب صوبوں کے لوگ خود چلائیں۔ اور ایسا نظام ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہوگا جس میں اختیارات زیادہ تر ایک آدمی کے ہاتھ میں ہوں۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ایک ہی صوبے سے ہوگا اور دوسرے صوبوں کے فتنہ پردازوں کو لوگوں کے احساسِ محرومیت کو ایکسپلائٹ کرکے فتنہ پھیلانے اور انتشار پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔

پاکستان سمیت مسلم ممالک کی سیاسی صورت حال کا جو نقشہ ہم نے ابھی ماضی کے تجربات کی روشنی میں کھینچا ہے کیا اس کے تجربے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاں نظامِ حکومت ایسا ہونا چاہیے جہاں ایک مضبوط شخص کے بجائے حکومت کے اختیارات متعدد آدمیوں اور اداروں کے ہاتھ میں ہوں تاکہ کوئی شخص اپنی من مانی نہ کر سکے۔ کیا فوجی جرنیلوں نے عسکری قوت کے بل پر جعلی انقلاب لانے کا جو سلسلہ مسلم ممالک میں شروع کر رکھا ہے اور اسے ختم کرنے کا وہ نام نہیں لیتے، اور اس کو بدلنے کے لیے عوام کو جان سے کشمکش کرنی پڑتی ہے اور اس سے جو خون بہتا ہے اور فتنہ و فساد بڑھتا ہے تو کیا "سد الذرائع" کا کلیہ اس امر کا متقاضی نہیں ہے کہ اس سلسلے کو ختم کیا جائے۔ اور ایسے ادارے بنائے جائیں اور انہیں مضبوط کیا جائے جو عوام کی رائے سے پُرامن انتقالِ اقتدار کا سبب بنیں اور ان اُمور کا فیصلہ ایک بااختیار آدمی کے ہاتھ میں نہ ہو۔

اسی طرح اسلامی شریعت کی تطبیق اور اسلامی نظامِ زندگی کی بحالی کے نقطۂ نظر سے سوچیے تو کیا شریعت کے مقاصد اس طرح پورے ہو سکتے ہیں کہ اکثر اختیارات ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں۔ اگر وہ اچھا ہو تو سبحان اللہ، لیکن اگر وہ بُرا ہو تو پھر اس کا

علاج کیا ہوگا؟ کیا اس کے بجائے بہتر نہیں کہ شریعت کی تطبیق اور نفاذ کے لیے ایک مضبوط آدمی پر انحصار کرنے کے بجائے ایسے اداروں پر انحصار کیا جائے جس میں افراد خواہ طاقت ور نہ ہوں اور آتے جاتے رہیں، لیکن یہ ادارے ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت مقاصدِ شریعت کو پورا کرنے کے لیے تدریج کے ساتھ کام کرتے رہیں اور ان کے اثرات بھی دیرپا نکلیں۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ آج نہ ہمارے حکمران حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ہیں اور نہ ہمارے ہاں اُس وقت کے عوام کی طرح ہیں تو کیا اس کا یہ حل مناسب نہیں ہے کہ اختیارات ایک آدمی کو دینے کے بجائے تقسیمِ اختیارات کے فارمولے پر عمل کیا جائے تاکہ کسی کو جابر اور ظالم بننے کا موقع ہی نہ ملے!

ان دلائل کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موجودہ حالات میں جو امر عام مسلمانوں کے بالعموم اور ہم پاکستانیوں کے مفاد کے بالخصوص عین مطابق ہے، اور جو طرزِ حکومت ان کے بہترین مفاد میں ہے، وہ ایک ایسا نظام ہے جس میں اکثر اختیارات ایک آدمی کے پاس نہ ہوں، بلکہ مختلف اداروں کے پاس ہوں جنہیں چلانے میں عام باشندگانِ ملک اور انتظامی وحدتیں برابر کی شریک ہوں؛ اور یہ ادارے ایک دوسرے کے اختیارات کی نگرانی کرتے رہیں تاکہ کوئی ایک عنصر دوسرے پر حاوی نہ ہوسکے، جس میں آدمی آتے جاتے رہیں اور یہ ادارے طے شدہ طریقے سے قومی اور دینی مقاصد کے لیے کام کرتے رہیں۔ اور یہ ادارے دیرپا ہوں، آدمی اُن کو ختم نہ کریں، بلکہ یہ آدمیوں کو جنم دیں، اُن کی تربیت کریں اور انہیں قومی مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ کارآمد بنائیں۔ "ھٰذا ما عندنا والعلم عند اللہ"

اپنا احتساب آپ

(۱۹۸۳ء کے چہرے کے بدنما داغ)

اخذ و اقتباس از شیخ افتخار احمد - ترتیب و تہذیب نعیم صدیقی

(۲)

ڈائریکٹر فرار ڈائریکٹر علماء اکیڈیمی محکمہ اوقاف لاہور کے گھر واقع گلبرگ سے جوا کھیلتے ہوئے سی آئی اے والوں نے ۱۷ افراد کو گرفتار کیا - ڈائریکٹر صاحب موقع پا کر فرار ہو گئے - ۸۴ ہزار ۲۹۷ روپے کی رقم جو داؤں میں لگائی گئی تھی، ضبط کر لی گئی اور تین کاروں اور سکوٹر کو قبضے میں لے لیا - اس اڈے کی فیس داخلہ ۱۰۰ روپے ماہوار تھی جس سے ۶ ہزار روپے ہر ماہ اکٹھے ہوتے تھے - گرفتار شدگان کو پولیس نے ضمانتوں پر رہا کر دیا -

(نوائے وقت اور تمام اخبارات - ۱۹ جولائی ۱۹۸۳ء)

خونِ حسینؓ فلم خونِ حسینؓ کی تیاری سے متعلق تمام اعلیٰ افسر برطرف کر دیئے گئے ہیں کیونکہ بیرونِ ملک اس فلم کی نمائش سے پاکستان کے وقار کو نقصان پہنچا ہے -

(ارشاد وزیر ثقافت - مشرق مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۳ء)

واضح رہے کہ یہ فلم ۷۷-۱۹۷۶ء میں تیار کی گئی تھی - یہ فلم نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ اور سٹیٹ اتھارٹی کے تعاون سے .... تیار ہوئی تھی اور ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کی ایک تحقیقاتی ٹیم کی سفارش پر نیف ڈیک اور سٹیٹ فلم اتھارٹی کے سربراہ ملازمتوں سے برطرف کر دیئے گئے تھے - نیف ڈیک کے منشور پر نظر ثانی کی گئی اور سٹیٹ فلم اتھارٹی

توڑ دی گئی تھی - اس فلم کی پروڈکشن اور دوسرے معاملات سے تعلق رکھنے والے کئی سینئر افسر بھی بے قاعدگیوں کے الزامات کے تحت برطرف کر دیئے گئے تھے[1]

وی، سی، آر کے کرشمے محلے کا کوئی ایک شخص اپنے گھر میں وی سی آر لگا کر وہاں سے محلے کے دس بارہ قریبی گھروں کے ٹیلی وژنوں کو مربوط کر لیتا ہے - پھر ایک ہی فلم بیک وقت کئی گھروں میں ماں باپ، بیٹے بیٹیاں اور بہویں مل کر دیکھتے ہیں - مرکزی ٹیلی وژن والا شخص فلم کے دوران میں ازراہ مذاق حیا سوز اور عریاں "ٹوٹے" (فلمی ٹکڑوں کے لیے پنجابی اصطلاح) لگا دیتا ہے - یہ "ٹوٹے" بیٹی کی آنکھ سے باپ کی عظمت کو اور بہن کی آنکھ سے بھائی کے احترام کو ختم کر دیتے ہیں - مشاہدے میں ایسے گھرانے بھی آئے ہیں جہاں خاندان کے چھوٹے بڑے افراد سب مل کر عریاں فلمیں بڑے جوش و خروش اور اہتمام سے دیکھتے ہیں - والدین کی عدم موجودگی میں ایسے گھرانوں کے بیٹے بیٹیاں مرکزی شخص سے بلیو پرنٹ فلموں (جن میں نہایت عریاں اور وحشت کے ساتھ فعلِ بد کا سارا نقشہ دکھایا گیا ہو) کا تقاضا کرتے ہیں -

(پشاور سے ایک دردمند کا خط - جسارت کراچی - ۲ اگست ۸۳ء)

فیشن شو سینٹ جوزف کالج صدر کراچی میں کل رات "فیشن شو" کا اہتمام کیا گیا - یہ اہتمام نئی پرنسپل کے تقرر کے فوراً بعد ہوا (غالباً بطور استقبال کے! ن - ص)

فیشن شو میں مرد فن کار جاوید شیخ اور محمود مسعود کو بطور مہمان مدعو کیا گیا تھا جو نوجوان طالبات سے ہنسی مذاق کرتے رہے - بعض طالبات کی فرمائش پر جاوید شیخ سے رقص بھی

---

[1] معلوم نہیں کہ پھر ان افسروں کا کیا بنا - بعد میں تو یہ پالیسی نمایاں محسوس نہیں ہوئی کہ غلط کار افسروں کو احتساب میں جکڑا جائے، بلکہ بسا اوقات کئی دیدہ دلیر غلط کاروں کو عام معافی دے دی گئی ہے - اور بعض کو پہلے سے بھی اعلیٰ مناصب پر لگا دیا گیا ہے - ممکن ہے کہ متذکرہ افسروں کو بھی مراتبِ عالیہ کی طرف بڑھنے کا راستہ عفوِ عام کے ذریعے مل گیا ہو، مگر تفصیلی معلومات ہمارے سامنے نہیں ہیں یہ تو صرف ایک امکان کا بیان ہے جس کے لیے نظائر موجود ہیں (ن - ص)

کرایا گیا۔ ذرا اس "اسلامی" دور کی طالبات کے جذبات ملاحظہ کیجیے۔ ف۔ص)
فیشن شو کے لیے بعض طالبات نے نیم عریاں مغربی لباس پہن رکھا تھا اور کالج کی پرنسپل نے انہیں اسٹیج پر آنے سے نہیں روکا۔ (آخر کونسی اور بلا ہے جو رکی ہوئی ہے، صرف اتنا کافی ہے کہ شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ دیا جائے۔ ف۔ص) اور اپنے جسموں کی نمائش کرنے کے بعد وہ اسٹیج سے رخصت ہوئیں۔
شام ۶½ بجے یہ محفل شروع ہوئی اور رات دس بجے تک جاری رہی۔ رقص و موسیقی کا سلسلہ بھی رات دس بجے تک جاری رہا۔ (سبحانے کتنا عظیم ثواب اس محفل شبانہ کا خدا کے ہاں شرکا اور ذمہ داروں کے نام درج ہوا ہوگا۔ ف۔ص)
فیشن شو کے دوران میں مغربی موسیقی بھی سنائی گئی اور ملی دھنیں بجائی جاتی رہیں۔ درحقیقت فیشن شو کے نام پر کالج کی طالبات کو مغربی طرز کی نیم عریاں رکھنے والی پوشاکیں پہنائی گئیں (گویا بڑی ترقی نسواں ہوئی اور بڑا اسلامی کردار پیدا ہوا۔ ف۔ص)
بن بلائے کئی مرد حضرات اس شو میں شریک ہو کر نظارہ بازی کرتے رہے۔

(روزنامہ امن کراچی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

ترکی رقص برہنہ | کراچی کے ہوٹلوں میں "ثقافتی شو" کے نام پر ترک لڑکیوں کا برہنہ رقص پیش کیا گیا۔ کمشنر کراچی نے ڈپٹی کمشنر ساؤتھ کو ہدایت کی ہے کہ فیشن ایبل ہوٹلوں میں "ثقافتی شو" کے نام پر ہونے والی فحاشی کو رکوائیں۔ اور عریاں رقص پیش کرنے والوں اور اس کے ذمہ دار حضرات کے خلاف کارروائی کی جائے۔

اطلاع کے مطابق ترک لڑکیاں برہنہ رقص پیش کرتی ہیں اور فحش لطیفے سناتی ہیں۔ پاکستان آرٹ[1] پروموٹرز نے ترکی سے ان فن کاروں کو اجرت پر منگوایا ہے۔ ان فن کاروں

---

[1] ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ثقافتی شو اور آرٹ پروموشن کے اصلی معنی اور معیار کیا ہیں اور غور کیا کہ ایک اسلامی ملک کی طرف سے دوسری اسلامی ریاست کو کیسا ہدیۂ دوستی پیش کیا گیا ہے۔

کی طرف سے ۲۴ اگست کو پیش کیا جانے والا پروگرام سب سے زیادہ قابلِ اعتراض تھا ابھی تک کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی ۔

(رپورٹ روزنامہ امن کراچی - ۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

شادی ایک قانونی بدکاری ہے مشہور ٹی وی ایکٹریس خالدہ ریاست نے ہیرلڈ کو جو انٹرویو دیا ہے اس میں اور بہت سی قابلِ اعتراض لغویات کے ساتھ یہ "فتویٰ" بھی جاری فرمایا ہے کہ شادی ایک لیگلائزڈ پروسٹی ٹیوشن (LEGALIRED PROSTITION) یعنی قانونی (یا نعوذ باللہ "شرعی") بدکاری ہے - یعنی فی نفسہٖ تعلق زن و شو بدکاری تو ہے ہی، جیسے ہر حال میں ہوتے رہنا ہے، لیکن نکاح کے ذریعے صرف اتنا فرق پڑتا ہے کہ وہ قانونی ہو جاتی ہے ۔

بچارے معذور سرکاری حکام کراچی میں رقص و سرود کی محفلیں پھر سجنے لگی ہیں - سرکاری حکام نے پابندی لگانے سے معذوری ظاہر کر دی ہے (جی ہاں ! پابندی تو صرف طلبہ کی یونینز پر لگانا ان کے بس میں ہے ! ن - ص) اس معذوری کے اعلان کے بعد شہر کے مختلف ہوٹلوں، کلبوں اور بازارِ حسن (یا بازارِ گناہ ! ن - ص) میں شامِ موسیقی کے علاوہ ثقافتی پروگراموں کی آڑ میں عصمت کے کاروبار کی تجدید بھی ہو رہی ہے ۔

بتایا گیا ہے کہ ڈپٹی کمشنروں نے اپنے علاقوں کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ناچ گانے اور "ڈسکو" پر پابندی عاید کر دی تھی، جب کہ بازارِ حسن کی طوائفوں نے مارشل لا حکام کو درخواستیں ارسال کی تھیں کہ اُن کا آبائی پیشہ گانا بجانا ہے، اس لیے اس کی انہیں اجازت دی جائے ۔ اس کے علاوہ انجمن موسیقارانِ کراچی نے بھی درخواست دی - مارشل لا حکام نے ان درخواستوں پر غور کرنے کے بعد انجمن موسیقارانِ کراچی کے سیکرٹری جنرل کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ اس سلسلے میں نظم و ضبط برقرار رکھا جائے اور ناچ گانے کی عوامی محفلیں منعقد کرنے کی اجازت نہ دی جائے تاہم عمارتوں، احاطوں اور چار دیواری کے اندر ناچ گانے کی محفلوں پر کوئی پابندی نہیں ۔

(روزنامہ جسارت - کراچی، ۷ دسمبر ۱۹۸۳ء)

"ہلال احمر" کے نام کی آڑ میں ہفتۂ ہلال احمر کے سلسلے میں ایک پرائیویٹ اسکول میں مینا بازار کا اہتمام قریبی سینما میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا۔ بچیوں سے ڈانس کرایا گیا اور فلمی گانے سنوائے گئے۔ بچیوں کی عمر ۱۲، ۱۵ سال کے اندر تھی۔ انہوں نے پنجابی کا ایک لچر گانا لہک لہک کر گایا۔

اس پروگرام کا ٹکٹ دو روپے تھا۔ بچے، بڑے، جوان اور بوڑھے سب اس میں شریک ہوئے۔ ہال میں نوجوان لڑکوں نے بے ہودہ حرکتیں کیں (جیسی کھیتی، ویسا پھل ۔ ا ف ۔ ع)

شیخوپورہ میں طالبات پر احسان شیخوپورہ کے گرلز کالج میں مینا بازار کے نام پر مختلف پروگرام مرتب کیے گئے، جن میں وی۔ سی۔ آر فلموں کی نمائش، فیشن شو اور ڈانس کے پروگرام شامل تھے۔ شہریوں اور اسلامی حلقوں کی طرف سے شدید احتجاج کا اظہار کیا گیا۔

(روزنامہ نوائے وقت و جنگ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء)

خوش آمدید ریٹائرڈ جنرل رحیم الدین نے تعلیم یافتہ لڑکیوں سے اپیل کی کہ وہ پی آئی اے میں بطور ایئر ہوسٹس شامل ہوں۔ پی۔ آئی۔ اے انہیں خوش آمدید کہے گی۔

(تقسیم اسناد کی تقریب سے خطاب۔ ۳۰۔ دسمبر ۸۳ء)

اب ۱۹۸۴ء ہم سے پوچھتا ہے کہ آیا واقعی تم نے بہ حیثیتِ قوم متذکرہ سارے اقدام اسلام کو فروغ دینے کے لیے پیش قدمی کے طور پر کئے ہیں؟

کیا اسلام ایسے ہی مشاغل کے فروغ کے لیے آیا تھا؟

کیا ان احوال پر اسلام کا لیبل چسپاں کیا جا سکتا ہے؟

رسائل و مسائل

معاشی مشکلات اور ناجائز آمدنیاں

شعبۂ استفسارات - منصورہ - لاہور

سوال :- ترجمان القرآن کا ایک عرصے سے مسلسل قاری ہوں - آپ کے اشارات پڑھ کر فوراً ایک جذبات کا سیلِ رواں اُٹھتا ہے - لیکن فوراً ہی جب عملی قدم اُٹھایا جاتا ہے تو جھاگ کی طرح یہ جذبات بیٹھ جاتے ہیں -

میں بنک دولتِ پاکستان راولپنڈی میں ملازم ہوں - یہاں پیچیدگیاں کچھ اس قسم کی ہیں کہ ایک آدمی اگر کچھ کام کرنا بھی چاہے تو نہیں کر پاتا - ہر ہر قدم پہ غلط کام ہوتے ہیں - مجبوراً ہی سہی لیکن کرنے تو بہر حال پڑتے ہیں - مثلاً آج کل میں بنک کے (VERIFICATION DEPARTMENT) میں کام کرتا ہوں - یہاں پُرانے اور بوسیدہ نوٹوں کی گنتی کر کے ان کو جلانا ہوتا ہے - لیکن صورتِ حال یوں ہے کہ نوٹ گنے نہیں جاتے اور دستخط کر دیئے جاتے ہیں کہ ہم نے نوٹ گنے ہیں - اب آپ کوئی راہ بتائیں کہ ہم ایسی صورت میں کیا کریں؟

چھٹی کے لیے ہی درخواست دینی ہو تو روایت یہی ہے کہ گھر سے بیماری کی درخواست بھجوا دی جائے، چاہے بندہ بیمار ہو یا نہ ہو -

بنک میں ہر سال سیلاب فنڈ ملتا ہے - تمام ملازمین کو ایک گوشوارہ لکھ کر دینا ہوتا ہے کہ میرا اتنا نقصان ہوا ہے - جب کہ صورتِ حال یکسر مختلف ہوتی ہے -

بالکل اسی طرح ہمیں مکان کی (CEILING) ملتی ہے اور ایک اسٹامپ پیپر

یہ باقاعدہ اقرار کیا جاتا ہے کہ کرایہ دار اور مالک مکان کے مابین اتنا کرایہ ہے وغیرہ وغیرہ لیکن یہاں بھی مسئلہ وہی ہے اور غلط بیانی صدفی صد ہوتی ہے۔

یہ تو چند ایک چیزیں ہیں ورنہ تو کیا کیا نہیں ہوتا پھر صرف ایک بنک کی ملازمت میں ہی نہیں، تمام شعبوں میں قریب قریب ان ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

معاشی مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں پھر فی زمانہ اتنی ہوش ربا مہنگائی ہے کہ بیان سے باہر۔ اگر نوکریاں چھوڑیں تو پھر کیا کریں؟ زراعت ہم نہیں کر پاتے، بلکہ مسئلہ تو یہ ہے کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہاتھ ڈالا جائے تو کوئلے کی دلالی میں منہ کالا والی بات نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ یہ سب مجبوریاں ہیں۔ ہوسکتا ہے بلکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو مستثنیات قرار دے کر وقتی طور پر طفل تسلی حاصل کی جاتی ہے لیکن ذہن میں جو چبھن رہتی ہے اس کا مداوا کیسے ہو؟ اور کیونکر ہو؟ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم جب دعوتِ اسلام لے کر دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو ہم خود جھجک محسوس کرتے ہیں جب کہ یہ آیت سامنے ہوتی ہے کہ "تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں"۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کہ اگر ہم خود ایک بات پر عمل پیرا نظر نہیں آتے تو ہماری دعوت کیا اثر کرے گی؟

جب ایسے حالات ہوں تو پھر ہمارے لیے لائحہ عمل کیا ہو۔ بار بار سوچا لیکن عقل معطّل ہو جاتی ہے، فکر ٹھٹھر جاتی ہے۔ بالآخر نظرِ انتخاب آپ ایسے دانشوروں پر پڑتی ہے کہ یہی حضرات ہماری رہنمائی کے لیے کوئی عمدہ حل تجویز کرسکتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ جامع قسم کی ہدایات دیں گے تاہم کچھ تو مطمئن ہوسکیں۔

جواب: خط ملا اور اس پیچیدگی کی تفصیل معلوم ہوئی جو آپ کو درپیش ہے۔ دراصل پورے معاشرے میں یہ کشمکش ہر سطح کے لوگوں کو درپیش ہے۔ ایک طبقہ (زیادہ بڑا) کا خیال یہ ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی اس جنگ میں ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ دوسرے نسبتاً کم تعداد گروہ کا ایمانی فیصلہ یہ ہے کہ یہ جنگ ہر حال میں لڑتے رہنا ہے،

کیونکہ خدا اور رسولؐ کا بتایا ہوا راستہ یہی ہے۔

اب جس کا جی چاہے وہ راستہ پسند کرلے، اور جس میں ہمت ہو وہ "تو بازمانہ ستیز" کا مسلک اختیار کرلے۔

اب چند سوالات کے تفصیلی جواب:۔

۱۔ آپ خراب شدہ نوٹوں کو گن کر بھی رپورٹ مرتب کر سکتے ہیں۔

۲۔ آپ چھٹی کی درخواست اس صورت میں دیں جب کہ حقیقت میں بیماری یا دوسری کوئی شدید وجہ موجود ہے، ورنہ ایسا نہ کریں۔

۳۔ آپ اپنی حد تک نقصان کا گوشوارہ صحیح داخل کریں۔

۴۔ مکان کے مسئلے میں جو قرض یا مدد ملتی ہے، اس کے لیے کوئی غلط صورت اختیار نہ کریں۔

جہاں تک معاشی تنگ دستی کا تعلق ہے، دو گزارشات کرتا ہوں:۔

ایک یہ کہ زندگی کے معیار ــــــ مکان کی مکانیت، لباس، سواری، سامانِ آرائش سامانِ آسائش وغیرہ ــــــ پر قابو پائیں۔ آمدنی کے مطابق اسے اس حد تک رکھیں کہ کام چل سکے۔ سوسائٹی کے (STATUS) کی پروا نہ کریں۔

دوسرے یہ کہ ضمناً کوئی دوسرا ذریعہ معاش (PART TIME) آپ یا آپ کے گھر والے ہاتھ میں لیں۔

یہ راستہ چھوڑ دیں تو کوئی بھی آمدنی ایسی نہیں ہے جس پر آپ مطمئن ہوسکیں اور جو خواہشوں اور معاشرے کے رواجوں کا ساتھ دے سکے۔

سیدھی طرح اللہ کے سامنے یہ بات رکھ دیں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ رزقِ حلال میں میں تجھی سے وسعت چاہتا ہوں، تو جتنا کچھ دے اس پر شکر کرنے والا بندہ ہوں۔ جب یہ بات ضمیر میں بیٹھ جائے گی تو آپ کو باہر کی کسی شان وشوکت پر رشک نہیں آئے گا اور آپ اپنی حلال آمدنی کی حد ہی میں گزر بسر کر کے خوشی محسوس کریں گے۔

اب یہ آپ کا اپنا کام ہے کہ اپنے لیے مسلک کا فیصلہ کریں کسی مفتی کے فتویٰ پر اس کا دارومدار نہیں ہے۔

(نعیم صدیقی)

ٹیوبی بچے

سوال :- خدا ہمیں راہِ حق میں استقامت عطا فرمائے۔

میرا سوال ہے کہ (TEST TUBE) بے بی کی وبا ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے پچھلے ہفتے سعودی عرب میں بھی ایک ایسے بچے کی پیدائش ہوئی۔ اس سلسلہ میں تفصیلی اور تحقیقی مقالہ ترجمان القرآن میں آ جائے تو اچھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مجھے ضرور لکھ دیجئے کہ ایسے بچے کی نسبت کس طرح ہوگی۔ وراثت کا حق کس طرف سے ہوگا اور پھر دوسرے مرد سے (SPERM) اور دوسری عورت کا (OVUM) مل کر بچے کا نسب کس طرح ہوگا۔ خاوند اور بیوی کا SPERM اور OVUM TEST TUBE میں FERTILIZE کر کے پھر ماں کے رحم میں رکھ دینا تو جائز لگتا ہے، لیکن غیر مرد اور غیر عورت کے جراثیم کا اختلاط اسلام کی تعلیمات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی جواب مرحمت فرمائیے۔

دوسری بات ایک (INFORMATION) ہے۔ نجران جو کہ تاریخی شہر ہے۔ اس میں اصحاب الاخدود کا وہ تاریخی مقام ہے جس کا ذکر سید رحؒ صاحب نے جلد ششم تفہیم القرآن میں سورہ البروج میں تفصیل سے کیا ہے۔ سید صاحبؒ اپنے سفر ارض القرآن میں شاید ادھر نہ تشریف لا سکے۔ میں نے اس مقام کی کچھ تصاویر لی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو وہ تفہیم القرآن میں متعلقہ مقام پر لگائی جا سکتی ہیں تاکہ یہ کمی بھی پوری ہو سکے۔ آپ کے حکم پر وہ تصاویر میں آپ کو بھجوا سکتا ہوں۔

جواب :- موجودہ "ترقی یافتہ" مغربی دنیا کا معاشرہ چونکہ اخلاقی قدروں کو تباہ کر چکا ہے، اس لیے وہاں اب جو بھی تحقیقات و ایجادات ہوتی ہیں۔ ان میں یہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا کہ کسی امر کی اخلاقی حیثیت کیا ہے۔

سنتے ہیں کہ گھوڑوں کی اچھی نسلیں حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ رائج تھا کہ گھوڑے کا مادۂ تولید کسی نلکی میں لے کر مقررہ وقت کے اندر کسی گھوڑی کے رحم میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ لیکن اب تو انسان خود کو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے لے آیا ہے۔ جن معاشروں میں یوں بھی حرام اولادیں ہر طرف پیدا ہوتی ہوں

اور کنواری ماؤں کا ایک وسیع طبقہ موجود ہو اور جہاں ایک ایک عورت کئی کئی مردوں کو آسودہ کرتی پھرے، چاہے وہ شوہر دار ہو، وہاں ٹیوبی بچوں کے حلالی یا حرامی ہونے کو کون دیکھے گا۔ یہ تو صرف ایک سچا مسلمان ہی ہے جو خیر و شر، جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں تمیز کرتا ہے۔

میرے خیالات اس معاملے میں یہ ہیں:-

۱- اس طرح کے اکا دکا تجربات چاہے جانوروں یا انسانوں کے متعلق ہوں (حرام طریق سے نہیں) سائنسی تحقیقات اور معلومات افزائی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

۲- مگر انسانوں میں نسل کشی کا یہ مستقل طریقہ ہرگز درست نہیں جس میں ایک مرد باپ ہونے کے بہت سے فرائض اور عورت ماں ہونے کی بہت سی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جائے کیوں کہ صرف فطری طریقہ ہی وہ احساسات اور اخلاقی ایثار اور تحمل و مشکلات کے اوصاف پیدا کرتا ہے۔ اس راستے سے ہٹنے کے معنی انسانی قدروں سے دور تر ہونے کے ہیں۔

۳- غیر منکوحہ مرد و زن یا شوہر اور بیوی کے علاوہ کسی بھی دوسرے کے تولیدی جینز کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہو گی وہ حرام کی اولاد تو لازماً ہو گی، خواہ وہ رحمِ نسوانی میں پرورش پائے یا کسی ٹیوب میں

۴- اولاد اگر حرام کی ہو تو اس کے لیے وراثت اور دیگر معاملات میں وہی احکام ہوں گے جو شریعت کے ہیں۔

۵- کسی بانجھ عورت یا بانجھ مرد کی مشکلات کا حل یہ نہیں ہے کہ ان کے لیے مادہ تو کسی دوسرے فریق کا حاصل کر لیا جائے۔

اوّل تو اب ایسے ہارمون اور دیگر ادویہ اور انجکشن اور آپریشن سامنے آ رہے ہیں کہ بانجھ پن کا علاج ممکن ہے۔ اگر آج نہیں تو کل ضرور ہو گا۔

لیکن اگر بانجھ پن سے نجات ممکن نہ ہو تو آخر پیدائشی طور پر کئی بچے اندھے، گونگے، بہرے اور لنگڑے بھی پیدا ہوتے ہیں۔

بہت سی عورتیں بانجھ ہونے کے باوجود، یا بہت سے جوڑے بے اولاد ہونے کے باوجود دوسری خوبیوں کی وجہ سے ایسی اچھی زندگی گزارتے ہیں کہ کسی دوسرے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اُن کے ہاں کوئی کمی ہے۔ ایسی دو ایک اچھی مثالیں میرے سامنے ہیں۔ (نعیم صدیقی)

مدعی کے حق دعویٰ پر تحدید

سوال :۔ بعض معاملات کو عدالت میں فیصلہ کے لیے لے جانے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ مقدمہ ایک خاص مدت میں دائر کیا جائے۔ مدت گزر جانے کے بعد عدالت کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ مقدمہ کی سماعت کرے یا نہ کرے۔ سماعت کی صورت اس وقت ممکن ہے جب کہ مدعی کی طرف سے تاخیر کی معذرت کی جائے۔ عدالت کو اختیار ہے کہ مدعی کی معذرت قبول کر کے سماعت کے بعد مقدمہ کا فیصلہ کرے یا قانون تحدید مدت (LIMITATION ACT) کے تحت اس مقدمہ کو خارج کر دے۔

ایسے کئی قوانین پاکستان میں نافذ العمل ہیں مثلاً ایک شخص کی جائیداد اراضی پر کوئی دوسرا شخص ناجائز طور پر متصرف ہو جائے اور اس کے قبضہ پر بارہ یا بیس سال گزر جائیں تو عدالت اسی قانون تحدید مدت کے تحت اس زمین کو اس کے اصل مالک کو واپس نہیں دلوا سکتی۔ اور مدعی کے مقدمہ کو سماعت کیے بغیر خارج کر دیتی ہے۔ اسی طرح سرکاری یا غیر سرکاری کاروباری اداروں میں اسی نوعیت کا قانون ملازمین کے لیے وضع کیا گیا ہے جس کا نام قانون ادائیگی اُجرت (PAYMENT OF WAGES ACT) ہے اس قانون کی ایک شق کی رُو سے ملازم اپنی تنخواہ یا اُجرت کا دعویٰ تنازعہ شروع ہونے یا مالک ادارہ کے انکاری جواب دینے کے چھ ماہ کے اندر اندر کر سکتا ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ دے سکتی ہے۔ بعد میں اسی قانون میں ترمیم کر دی گئی۔ اور اس کے دعویٰ کرنے کی مدت کو چھ ماہ کے بجائے تین سال تک بڑھا دیا گیا۔ اب اگر کوئی شخص اُجرت نہ ملنے کی صورت میں اس کے حصول میں تنازعہ شروع ہونے یا آجر کی طرف سے جواب ملنے کے تین سال بعد اپنی غصب شدہ تنخواہ کا دعویٰ کرے تو زائد المیعاد ہونے کی وجہ سے (TIME BARRED) عدالت سے اس کا مقدمہ خارج ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ انگریزی دور کے بنائے ہوئے یہ قوانین اسلام نظام عدل

کی رُو سے جائز ہیں یا ناجائز۔ اگر جائز ہیں تو کتاب وسنّت کی رُو سے اُن کے جواز کی کیا دلیل ہے اور اگر ناجائز ہیں تو اس ناروا ظلم میں مظلوم کی دادرسی کے ازروئے قرآن مجید، احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ مجتہدین کی فقہ کی رُو سے ان قوانین کے عدم جواز ہونے کے دلائل کیا ہیں ؟

جواب :- آپ کے استفسار کا جواب یہ ہے کہ "مرور زمانہ" سے حقدار کا حق ساقط نہیں ہو جاتا اگرچہ زمانہ بہت طویل ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ حکومت دعویٰ کی سماعت کے لیے ایک زمانے کا تعین کرسکتی ہے اور اس سلسلہ میں قانون بنا سکتی ہے ، لیکن اس قانون میں کچھ شرائط ملحوظ رکھنا ہوں گی ۔

پہلی یہ کہ مدعی نے دعویٰ کسی شرعی عذر کی بنا پر ترک نہ کیا ہو۔ مثلاً مدعی چھوٹا تھا، مجنون تھا یا مسافر تھا یا مدعی علیہ ایسے گروپ کا فرد تھا جس نے زبردستی غلبہ حاصل کر لیا ہو اور مدعی نے ان وجوہ کی بنا پر دعویٰ نہ کیا ہو تو اس کا دعویٰ مرورِ زمانہ کے باوجود قابل سماعت ہوگا۔

(دُرَرُ الحکام جلد ۴ ص ۲۶۸)

دوسری یہ کہ مدعیٰ علیہ منکر ہو ، اگر مدعیٰ علیہ حق کا اقرار کرنے کے بعد ادائیگی کا دعویٰ کرے تو بھی دعویٰ قابلِ سماعت ہوگا اور مدعی علیہ سے ادائیگی کا ثبوت طلب کیا جائے گا۔ ثبوت پیش نہ کر سکنے کی صورت میں مدعی سے حلف لے کر اس کے حق میں فیصلہ دیا جائے گا۔ آپ نے جس قانون کے متعلق سوال کیا ہے وہ ان ان دو شرائط کے مطابق ہے تو قابل نفاذ ہے۔

(دُرَرُ الحکام جلد ۴ ص ۲۶۸)

تیسری یہ کہ دعویٰ کے قابلِ سماعت نہ ہونے سے عنداللہ حق ساقط نہیں ہوگا ۔ مدعیٰ علیہ دُنیا میں تو بعض صورتوں میں بری الذمہ ہو سکتا ہے ، لیکن آخرت میں اس سے باز پرس کی جائے گی۔ اس قانون میں ایک شق یہ بھی ہونی چاہیے کہ بطور ثالثی ایک فرد یا گروہ فریقین کو نصیحت کے ذریعے ایک دوسرے کا حق دلوانے کی کوشش کرے اور فریقین کو ثالثی پر آمادہ کرکے ثالثی کرائی جائے۔ ایسی صورت میں ثالثی کا فیصلہ نافذ ہوگا ۔ اگرچہ زمانہ زیادہ گذر گیا ہو۔

مطبوعات

خصائص نسائی فی مناقب مرتضوی رضؓ — از سید مہر حسین بخاری ۔ ناشر: مجلس تحفظ ناموس اہل بیت، کامرہ ۔ ضلع اٹک ۔ قیمت: ۔/۱۶ روپے

کتاب میں نسائی کی وہ احادیث پیش کی گئی ہیں جو مناقبِ مرتضوی میں وارد ہیں۔ حالانکہ دوسرے صحابہ کرام (خصوصاً خلفائے راشدین) کے مناقب بھی حدیث کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں اور ان سب کے عملی کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خرابی یہ ہے کہ ابتدائی دور سے جو فتنہ اُٹھا کہ اہل بیت ایک طرف اور دوسرے صحابہ دوسری طرف۔ اسی سے سبائیت بھی پیدا ہوئی اور ناصبیت اور خارجیت بھی۔ ایک گروہ اہل بیت کا حامی بنا اور اُس نے دوسرے اجل صحابہ پر تبرّیٰ جاری رکھا ۔ دوسری طرف ایک اور گروہ نے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی مخالفت کو شعار بنایا ۔ اس کا ایک بڑا ردِّ عمل ماضی کی تاریخ کی طرح اس دور میں یہ ہوا کہ محمود عباسی صاحب نے "خلافتِ معاویہ و یزید" لکھی اور ایک گروہ میں گرم کیکوں کی طرح بکی ۔ مگر علمائے اُمت نے اسے قبول نہیں کیا جیسا کہ عرضِ ناشر میں مذکور ہے ۔ اس کے خلاف اہل سنّت نے تنقیدی و تردیدی کتب لکھیں۔

سید مہر حسین بخاری صاحب اس پرانے تاریخی تضاد کو زندہ کرنے کے بجائے دونوں طرف کے صحابہ کرام کے فضائل پر لکھتے تو ان کی بات کا وزن دوسرا ہوتا ۔ کبھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے لیے تو آپ کلمۂ خیر لکھتے نہیں ۔ اس کے باوجود اہل سنّت فراخ دل اور وسیع النظر ہیں جو آن کا بھی احترام کرتے ہیں اور ان سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ براہِ کرم وحدت کی راہ اختیار کیجیے۔

مندرجہ احادیث میں سے بعض پہ بحثیں ہو سکتی ہیں، مگر اتنی گنجائش نہیں۔ اصل سوال دوسرا ہے جیسے عرض کر دیا گیا۔

اسلامی انقلاب دا سندلیہ | مجموعۂ کلام جناب عبداللہ شاکر صاحب۔ ناشر: اسلامی پبلیکیشنز لاہور۔ (۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ) قیمت ۔/۳۳ روپے

عبداللہ شاکر اپنے خاص رنگ کے واحد پنجابی شاعر ہیں۔ ان کا لہجہ انقلابی ہے۔ وہ معاشرے کے احوال کی اذیت ناک تصاویر سامنے لاتے ہیں۔ مقصدی بنیاد اُن کی اسلامی فکر پر ہے۔ اپنے ہم قسم شعرائے اُردو کی طرح وہ آگے آگے لپکنے کی کوشش نہیں کرتے، یہ ایک طرح کی فنی غیرت مندی ہے۔

اسلامی انقلاب کا سندلیہ کا مطلب ہے، اسلامی انقلاب کا پیغام۔ جب انھوں نے اوّل اوّل اس پیغام کو عام کرنا شروع کیا تو پولیس ان کو پکڑنے کے لیے گئی اور اُن کے ہاتھوں پیروں کی بیسیوں انگلیوں کے نشانات محفوظ کر لیے۔ اس لیے کہ کیا معلوم یہ شخص آگے چل کر غنڈوں سے زیادہ بڑا مجرم ثابت ہو۔ آج اس کی شاعری کا پورا نامہ اعمال ہمارے سامنے ہے۔ کبھی وہ اس پہ پریشان ہوتا ہے کہ اسلام کے چرچوں کے باوجود" بینوں لبھا نہیں اسلام کتے" (یعنی مجھے اسلام عملاً کہیں دکھائی نہیں دیا)۔ کبھی وہ اہلِ مذہب کو بتاتا ہے کہ دین کے لیے سیاست ضروری ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ انتباہ بھی کہ میٹھی چال چلنے سے اسلام نہیں آسکتا، بلکہ" اوکھی گھاٹی، مشکل پینڈا، عشق دیاں اسواراں دا"۔ "پاکستان کا مطلب کیا" اور "سیفٹی ایکٹ" سے لے کر" افغانستان روس دا قبرستان" اور" اللہ دے مہمان مہاجر افغان" تک رنگا رنگ نظمیں ہیں جن کا انقلابی لہجہ ایک سا ہے۔ خوبی یہ کہ" اسلامی بھیناں دا گیت"، "کشمیری بھین دی فریاد"، "اسلامی نظام دے قائم کرن وچ عورت دی ذمہ داری" جیسی نظموں کے ذریعے زندگی کی گاڑی کے دوسرے پہیے کو بھی حرکت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر چونکہ عبداللہ شاکر" جماعتِ اسلامی" کے فدائی رہے ہیں، لہٰذا بہت سی

نظمیں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر بھی کہی ہیں۔ نعتیہ جذبے سے بھی خوب لکھا ہے
میرا خیال ہے کہ پنجاب کے دیہاتی حلقوں میں عبد اللہ شاکر کے کلام کو تعمیر و اصلاح
کے کام کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ رح | تحقیق و ترتیب از ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ناشر: ملک سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد۔ قیمت: ۱۰/- روپے

ابو عقبہ ہمام ابن منبہ براہ راست حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد تھے اور صحابی مذکور نے جہاں احادیث کا ایک مجموعہ خود اپنے لیے مرتب کر رکھا تھا، وہاں انہوں نے ہمام ابن منبہ جیسے شاگرد کو (ف ۱۰۱ یا ۱۰۲ ھ) ایک سو چالیس حدیثیں سکھائیں۔ علاوہ ازیں ہمامؒ نے حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، زبیرؓ اور جناب معاویہؓ سے بھی روایات لی ہیں۔

اس صحیفہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ آج جو منکرین حدیث و سنت نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ احادیث نور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو تین سو سال بعد مدون ہوئیں۔ یہ صحیفہ اور اس کے واسطے سے ذخیرۂ حضرت ابو ہریرہؓ کے بالکل ابتدائی وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اب نئی تحقیقاتوں (جن میں مصطفیٰ اعظمی کا کام بہت اقدم ہے) نے بہت سے ابتدائی مخطوطات کا سراغ ڈھونڈ نکالا ہے تاہم اس صحیفہ کی اپنی ایک قدر و قیمت ہے۔ کئی سال ہوئے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ حال مقیم پیرس نے اسے ایڈٹ کر کے حیدر آباد دکن سے اس کے تین ایڈیشن نکالے۔ راقم کو یاد ہے کہ جب پہلے پہل اس کا نسخہ مجھ تک پہنچا تو میں نے کسی جگہ لکھا تھا کہ آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے لیے عید کا دن ہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری مندوب حکومت سعودی عرب (برائے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد) نے اس پر ایک معلومات افزا مقدمہ لکھا ہے۔

ڈاڑھی کا وجوب | از حضرت مولینا محمد زکریا صاحب مرحوم - مظاہر العلوم، سہارنپور۔
ناشر، عمران اکیڈیمی - ۴۴ بی، اُردو بازار لاہور۔ قیمت : ۲/- روپے

ڈاڑھی کا مسئلہ | از سید محمود الحسن - بہ اہتمام ادارۂ تفہیم قرآن وسنت - جامع العلوم قاسم باغ سرگودھا - قیمت درج نہیں -

ڈاڑھی کے متعلق "محسنِ انسانیت" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ص ۹۳ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظافتِ طبع کو نمایاں کرنے کے لیے مَیں نے یہ الفاظ لکھے کہ (آپؐ) ڈاڑھی کو بھی طول وعرض میں قینچی سے ہموار کرتے تھے"۔ اس پر متعدد اصحاب کے خطوط ملے کہ اس کا حوالہ کیا ہے - حوالہ مَیں نے کتاب میں درج کر دیا تھا، اور وہ یہ روایت تھی کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یاخذ من لحیتہ من عرضہا ومن طولہا - (ترمذی - ابواب الآداب، باب ماجاء فی الاخذ من اللحیۃ) -

مجھے معلوم تھا کہ بعض علماء اس روایت کو غریب، ضعیف یا مقطوع کہتے ہیں، مگر دوسرے علماء حضرت عبداللہ بن عمرؓ و دیگر صحابہؓ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے قول وعمل کو اس کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں - اور خود حنفی فقہ میں ڈاڑھی کو محض بمقدار یک قبضہ رکھنا ضروری ہے - محسنِ انسانیت میں مَیں نے فقہی مباحث کی طرف کہیں رُخ نہیں کیا - مگر مجھے کیا خبر تھی کہ بال کی کھال اُتاری جائے گی - میں نے ارادہ کیا کہ ایک مضمون پوری بحث اور جملہ اختلافِ مسالک پر پیش کر دوں، چنانچہ مواد جمع کر لیا - اسی دوران میں تین پمفلٹ ڈاڑھی کے مسئلہ پر موصول ہوئے - ایک "شرف المسلم" (عربی) جس میں روایات کو سامنے لا کر پوری شدت سے یہ فیصلہ دیا گیا ہے کہ ڈاڑھی سے نہ طول میں اور نہ عرض میں کوئی تعرض کرنا چاہیے - اس پر ترجمان میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے - اب جو دو پمفلٹ سامنے آئے ہیں، اُن میں سے اوّل الذکر میں زور" قبضہ" کی پابندی پر ہے اور دوسرے پمفلٹ " ڈاڑھی کا مسئلہ" میں ائمہ، فقہا اور مفکرین کے مختلف مسلک بیان کیے گئے ہیں -

میری نگاہ میں چند اُمور غور طلب ہیں :

۱- مجھے کوئی ثبوت اس کا نہیں مل سکا کہ ڈاڑھی کے کسی بال کو قینچی یا کوئی دوسرا آوزار بالکل نہ چھوئے - کوئی نص

صریح ایسی نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ بعض لوگوں نے الفاظ کے معانی سے استنباط و استخراج کر کے خود نکالا ہے، جو بجائے خود نص نہیں ہے۔ کوئی مخالفت اس امر کی شرعاً نہیں کی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی بال اِدھر اُدھر بڑھ جائے یا "سرکش" ہو جائے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ اسی طرح کوئی ممانعت اس کی ثابت نہیں کی جاسکتی کہ خط نہ بنوایا جائے اور اصل ڈاڑھی کے رقبے کے علاوہ جو بال رخساروں پر اُگ رہے ہوں اور نیچے گردن کی طرف اُگتے چلے جائیں، انہیں ہموار نہ کیا جائے۔ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے جید علما رخط بنواتے رہے ہیں۔

۲ — ڈاڑھی رکھنا ایک حکم ہے، مگر شریعت میں احکام و اوامر اور نواہی و منکرات کے مدارج ہیں۔ مثلاً ایک درجہ توحید اور آخرت اور نبوت پر ایمان رکھنے کا ہے، جو سب سے بلند ہے۔ اور ایک درجہ راستے سے کوئی رکاوٹ یا گندگی ہٹانے کا ہے، جو کم سے کم درجے کی نیکی ہے۔ اوّل الذکر کا ترک کامل خسران کا موجب ہے، مگر آخر الذکر کے ترک سے کوئی بڑا گناہ عاید نہیں ہوتا۔ ایک درجہ عبادت کا ہے، ایک جہاد کا ہے، اس طرح حرمتوں میں ایک زنا، شراب اور محرمات سے نکاح، سود خواری وغیرہ جیسے گناہ ہیں۔ یا جھوٹ، چغل خوری اور غیبت و شوخی جیسی خرابیاں ہیں۔

شریعت کے نظام میں عقائد، عبادات، قانون اور اخلاق کے مدارج کے بعد تہذیبی اُمور کا ایک درجہ آتا ہے۔ وضع قطع، اکل و شرب، بالوں کی تراش خراش، لباس کا رنگ، شادی بیاہ کے قاعدے، بچے کے کان میں اذان کہنا، کھانا کھاتے اور ہر کام کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھنا وغیرہ بے شمار چیزیں ہیں۔ ان چیزوں کو آداب (یا شعائر) کی تعریف میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ترمذی نے بھی ڈاڑھی کے مسئلے کو اسی باب میں رکھا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے اپنے سامنے سے کھا لینا قولی و فعلی سنت ہے، مگر اس پر نہ بحثا بحثی ہے، نہ رسائل در رسائل کا چکر چلتا ہے۔ ایک زمانے میں پگڑی اور ٹوپی کی بحث چلی، مگر آخر ساری باتیں گرد بن گئیں۔ ڈاڑھی کو اہمیت ضرور حاصل ہے، مگر ان اعمال میں جو آداب کی سطح پر آتے ہیں۔

۳ — اس مسئلے میں صحابہ، ائمہ فقہا اور دیگر دینی مفکرین میں اتنا اختلاف رائے ہے (ملاحظہ ہو ڈاڑھی کا مسئلہ مذکورہ بالا) کہ اس کے بعد کسی خاص پہلو پر تشدد کا رویہ اختیار

کرنا اور دوسرے نقطہ ہائے نظر کو بے وقعت قرار دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ میں یہاں سارے اختلافات کو نقل نہیں کرتا۔ اتنا ہی عرض کرتا ہوں ہمارے مختلف علما نے سلف نے نیک نیتی سے نصوص اور عمل صحابہ کو سامنے رکھ کر اور متعلقہ روایات کی چھان بین کر کے، اور ان میں کسی کو کسی پر ترجیح دے کر اپنا اپنا فقہی فیصلہ دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ سارے فیصلے اور بحثیں ہمارے لیے یکساں قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ کر کے جو جسے چاہے، ترجیح دے (مگر رضائے الٰہی کو سامنے رکھ کر)

۴ —— ڈاڑھی جیسے مسائل پر تحقیق و کاوش کرنے والے حضرات اپنی توجہ کا ذرا زیادہ حصہ شریعت کے ان اہم ترین مباحث کو دیں جن کی روشنی میں آج کے پیش آمدہ مسائل اور فتنوں کا توڑ کیا جا سکتا ہو۔

۵ —— اس معاملے میں بہتر یہ ہے کہ "رسائل و مسائل" میں مولینا مودودیؒ کی بحث ڈاڑھی کے متعلق پڑھ لی جائے۔

باقی متذکرہ دونوں رسائل کی میں قدر کرتا ہوں۔ کسی بھی نقطۂ نظر سے شریعت کے کسی تقاضے پر بحث و تحقیق پیش کرنا ایک کارِ خیر ہے۔ خدا دونوں کے مرتبین کو جزائے خیر دے۔

(بقیہ حامدی صاحب کے تحریکی سفر کی داستان)

دوپہر کا کھانا عباس صاحب کے ہاں کھایا۔ میرے ساتھ سوڈان کے ایک نئے مبعوث موسیٰ عمر محمد بھی ہیں۔ اسی ہفتے سوڈان سے آئے ہیں۔ دارالسلام ایئرپورٹ والوں نے انہیں ویزا دینے سے انکار دیا تھا۔ مگر عباس صاحب نے وزیر داخلہ سے رابطہ قائم کیا جو ان کے گہرے دوست ہیں۔ اس طرح سے موسیٰ صاحب دارالسلام میں داخل ہو سکے۔ موسیٰ بھی مدینہ یونیورسٹی کا فارغ ہے اور تحریک اخوان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تمام تصنیفات پڑھ رکھی ہیں، جو مدینہ منورہ کے مکتبات میں مجھے مل سکی ہیں۔ سوڈان کے موجودہ بدلے ہوئے حالات پر نوجوان موسیٰ مطمئن تھا۔ (جاری ہے)

تفہیم القرآن

جلد چہارم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ
چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کرا سکتے ہیں۔

ادارہ
ترجمان القرآن لمیٹڈ
۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ
لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰ اپریل سنہ ۱۹۸۴

INDISPENSABLE BOOK FOR

JUDGES, ADVOCATES, ULAMA AND LAW STUDENTS

THE RECONSTRUCTION OF LEGAL THOUGHT IN ISLAM

Comparative study of the Islamic and the Anglo-American Systems of Law, and refutation of the Orientalists

(Revised and Enlarged Edition)

By
Dr. RIAZUL HASAN GILANI

FOREWORD
SYED ABUL A'LA MAUDOODI

Price : Rs. 50/-

IDARA TARJUMAN AL-QURAN
ICHHRA LAHORE